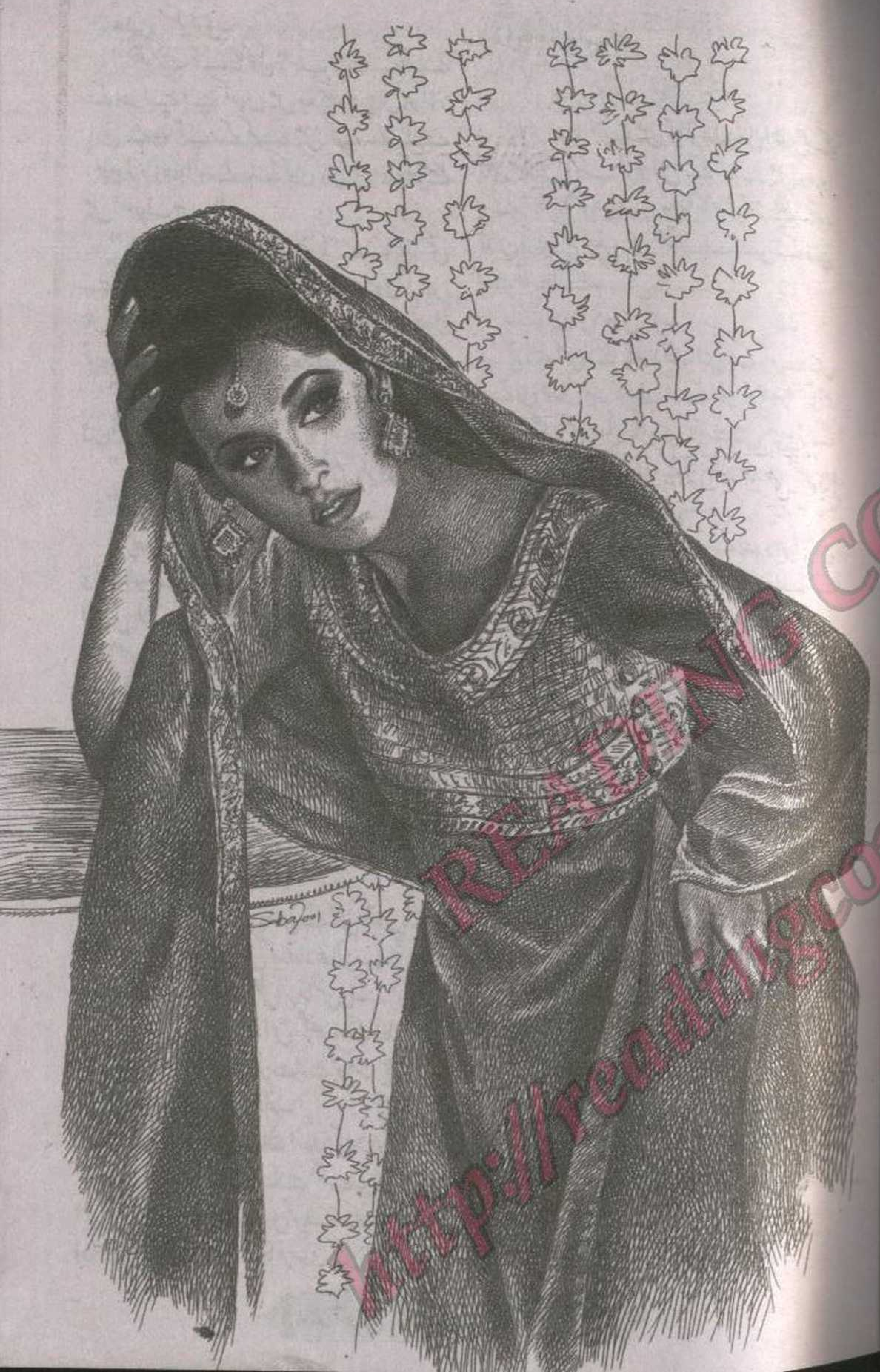

نادیہ کنول نازی

شہرِ خواب

ہم تو بس خواب ہیں کچھ پل میں بکھرنے والے
پھر کسی آنکھ کسی نیند میں آئیں گے نہیں
پھر کسی راہ، کسی موڑ پہ ہم ہوں گے نہیں
ہم تو بس گرد ہیں کچھ دیر میں چھٹ جائیں گے
ہم تو خوشبو ہیں ہمیں رنگ نہ دینا کوئی
صرف احساس کو چھو کر گزر جاتا ہے ہمیں
ہم تو آنسو ہیں بہیں گے تو نہ لوٹیں گے کبھی

ناولٹ

ہم تو بس زخم ہیں سینے کا ہمیں بھرنا ہے
ہم وہ احساس کی بیلیں ہیں جو چھاؤں چاہیں
درد کی دھوپ، جو چھو لیں تو ہمیں مرنا ہے
ہم تو بس خواب ہیں کچھ پل میں بکھرنے والے!

موسم اچانک خراب ہوا تھا۔ تیز آندھی کے بعد موسلا دھار بارش اور اس پر زور و شور سے چمکتی گرجتی بجلی نے اس کا ننھا سا دل سہما کر رکھ دیا۔ احزار ابھی گھر نہیں آیا تھا، جبکہ باقی نوجوان پارٹی اسی کے کمرے میں گھسی فلم دیکھ رہی تھی۔

علیزہ نے جائے نماز سمیٹ کر رکھنے کے بعد ایک نظر باہر صحن میں اوپر آسمان کی طرف دیکھا، پھر درود شریف کا ورد کرتی کچن کی طرف چلی آئی۔

سنک میں شام کی چائے اور رات کے کھانے کے برتن پڑے، ابھی تک اس کی نگاہ التفات کے منتظر تھے، وہ خاموشی سے برتن دھونے میں مصروف ہو گئی۔ تقریباً پچیس منٹ کے بعد احزار، بارش میں بھیگا گھر واپس آیا تھا۔

"ایکسکیوزمی... کوئی ہے؟"

وہ جانتا تھا کہ علیزہ کچن میں ہوگی، تبھی گھر میں داخل ہوتے ہی کچن کی طرف چلا آیا تھا۔ علیزہ نے ذرا سی گردن ترچھی کر کے اسے دیکھا پھر دوپٹے سے ہاتھ خشک کر لیے۔

"جی ہاں، سب ہی لوگ موجود ہیں، الحمدللہ بھرا پرا گھر ہے۔"

"اچھا... مگر تمہارے سوا کوئی نظر تو نہیں آ رہا..."

لیدر کی جیکٹ سے پانی کی بوندیں جھاڑتے ہوئے وہ اس کے قریب آیا تھا۔

READING CORNER
http://readingcornerpk.blogspot.com/

علیزہ مسکرادی۔
”نظر کیسے آئے گا کوئی؟ سب رات کے کھانے کے بعد اپنے اپنے کمروں میں جاچکے ہیں ہاں جو کزنز پارٹی ہے وہ آپ کے کمرے میں آپ کے پیارے کمپیوٹر پر دھاوا بولے جانے کون کون سی موویز دیکھنے میں مصروف ہیں۔“

”اچھا.... اور آپ جناب یقیناً“ میرے سلامتی سے گھر واپس آنے کی دعائیں مانگ رہی ہوں گی ہیں ناں؟“ روشن نگاہوں سے اس کی طرف دیکھتا وہ تھوڑا قریب ہوا تھا۔ علیزہ جلدی سے پیچھے کھسک گئی۔

”جی ہاں، لیکن کل سے اگر اتنی لیٹ گھر آئے تو میں بھی بالکل نہیں جاگوں گی۔“

”روز یہی دھمکی دیتی ہو، مگر عمل نہیں کرتیں؟“

”کیا کروں، مجازی خدا جو ہوئے۔“

”اچھا پھر کیا خیال ہے تائی اماں سے کہہ کر رخصتی نہ کروالوں۔“ شرارت سے لب دباتے ہوئے وہ پھر اس کی طرف تھوڑا سا جھکا تھا، تبھی علیزہ نے گھبرا کر فوراً“ اس کی طرف دیکھا۔

”خبردار، اگر یہ بے ایمانی کی تو بہت بری طرح پیش آؤں گی۔“

”اچھا اچھا بابا ٹھیک ہے۔ میں کمرے میں جارہا ہوں۔ ابھی ایک کپ گرما گرم چائے بنا کر لے آؤ، کھانا میں کھا کر آیا ہوں۔“

”ٹھیک ہے۔“

”گڈ گرل!“ محبت سے اس کے گال تھپتھپاتا ہوا اگلے ہی پل وہ کچن سے نکل گیا تھا۔ علیزہ نے اس کے جانے کے بعد بے ساختہ کھل کر سانس لی۔

کتنے سال ہوگئے تھے اس شخص کے نکاح میں آئے، مگر آج بھی اس کی قربت اسے بوکھلا دیتی تھی۔ اور اس وقت بھی ایسا ہی ہوا تھا۔

اس نے سن رکھا تھا کہ اللہ انسان کی شہ رگ سے بھی زیادہ اس کے قریب ہوتا ہے، مگر علیزہ حسین کو اس سچ کا یقین احزار عبدالہادی کو پانے کے بعد ہوا تھا، وہ احزار عبدالہادی جو اس کا فرسٹ کزن اور اس کی زندگی کا پہلا خواب تھا۔

✡ ✡ ✡

احزار اپنے کمرے میں آیا تو علیزہ کی اطلاع کے عین مطابق، سب کزنز اس کے کمرے میں دھاوا بولے، ”تقریباً“ وہاں موجود ہر چیز کا حشر بگاڑ چکے تھے۔ قالین پر چیونگم، چپس اور مختلف بسکٹس کے ریپر اسے غصہ دلا گئے۔

جانے کون سی مووی تھی۔

آزر جو اس سے چھوٹا تھا۔ اس کے کمرے میں آتے ہی فوراً“ نیند کا بہانہ کرتے اٹھ کھڑا ہوا، تاہم لڑکیاں ابھی بھی سوئی جاگی سی کیفیت میں کمپیوٹر کے سامنے براجمان، فلم ختم ہونے کا انتظار کررہی تھیں وہ اسے آتے دیکھ کر چلی گئی تھیں۔

وہ غصہ ضبط کرتا، فریش ہونے کے بعد وہیں بیڈ پر ٹک گیا، ”تقریباً“ پندرہ منٹ کے بعد علیزہ چائے لے کر آئی تو وہ بھی فلم دیکھنے میں مگن ہوچکا تھا۔ علیزہ نے ایک نظر ان سب پر ڈالنے کے بعد، چائے کا کپ احزار کے بیڈ کے پاس تپائی پر دھر دیا۔ کپ رکھ کر وہ جانے کے لیے پلٹ ہی رہی تھی کہ احزار نے اسے پکار لیا۔

”علیزہ۔“

”ہوں۔“

”تم مووی نہیں دیکھتیں؟“

”نہیں۔“

”کیوں؟“

”مجھے پسند نہیں، ویسے بھی باہر اتنا خراب موسم ہے، بجائے اللہ رب العزت کی پاک ذات سے ڈرنے کے ہم یہ گناہ کا کام کیوں کریں۔“

”اچھا پلیز فوراً“ لیکچر نہ شروع کردیا کرو، ابھی بیٹھو پلیز، مجھے اچھا لگے گا۔“

”نہیں، تمہیں دیکھنی ہے تو تم دیکھو، مجھے نیند آرہی ہے۔“

”صرف پانچ منٹ بیٹھ جاؤ، پلیز۔“

اس بار علیزہ کا بازو تھامتے ہوئے احزار کا لہجہ ملتجی ہوگیا تھا۔ اسے نہ چاہتے ہوئے بھی بیٹھنا پڑا۔ یسریٰ، نمل اور کومل جو اس کے چھوٹے چچا کی بیٹیاں تھیں۔ تینوں فلموں کی شیدائی تھیں اور یقیناً“ ان ہی کی ضد پر آزر نے احزار کا کمپیوٹر استعمال کرنے کی جرات کی تھی۔ کیونکہ احزار خود کو ان تینوں بہنوں کا اکلوتا بھائی سمجھتا تھا، اور اس کے دربار میں ان تینوں کے سارے قصور قطعی معاف تھے۔ اب تک جانے کتنی فلمیں دیکھی جاچکی تھیں۔

احزار ایک نظر اسکرین پر ڈال لیتا پھر موبائل کے ساتھ مصروف ہوجاتا۔ علیزہ نے دیکھا، سامنے اسکرین پر اس وقت نہایت بولڈ سین چل رہا تھا۔ اس کا دل بے ساختہ دھڑک اٹھا، موبائل کے ساتھ مصروف احزار عبدالہادی سے نگاہ چراتی، وہ ایک منٹ سے پہلے اس کے پہلو سے کھڑی ہوئی تھی۔

”کمپیوٹر آف کردو احزار! وہ سب جاچکے ہیں مجھے بھی بہت ٹوٹ کر نیند آرہی ہے۔“

”بات سنو۔“ اس کے فرار پر ایک نظر سامنے سکرین پر ڈالتے ہوئے احزار نے فوراً“ اسے روک لیا تھا۔ وہ دھڑکتے دل کے ساتھ نہ چاہتے ہوئے بھی رک گئی تھی۔

”ہوں۔“

”یہاں بیٹھو پلیز۔“

”احزار! مجھے نیند آرہی ہے۔“

”میری بات سمجھ میں نہیں آرہی تمہیں؟“ علیزہ کے فرار پر وہ خفا ہوا تھا۔ اسے نہ چاہتے ہوئے بھی بیٹھنا پڑا۔

”علیزہ....!“

صرف ایک لمحے کے بعد اس نے قدرے سرگوشی میں اسے پکارا تھا، علیزہ کے ہاتھوں میں کپکپاہٹ در آئی، احزار اس لمحے اسی کی طرف دیکھ رہا تھا۔

اک سال ہونے کو آیا تھا ان کے نکاح کو، مگر آج تک احزار نے کبھی کسی کمزور لمحے سے فائدہ اٹھانے کی کوشش نہیں کی تھی۔ دونوں کے درمیان بے تکلفی کے باوجود ایک فاصلہ رہا تھا۔ مگر اس وقت جانے کیا ہوا تھا کہ اس جیسا مضبوط اعصاب کا شخص بھی خود پر کنٹرول نہیں رکھ پایا تھا۔

اپنے اعصاب پر قابو پاتی علیزہ بھاگ کر احزار کے کمرے سے نکل آئی تھی، وہ اسے پکارتا ہی رہ گیا تھا مگر اس نے پروا نہیں کی۔

اپنے کمرے میں پہنچ کر ابھی وہ اپنی منتشر سانسوں کو سنبھال بھی نہ پائی تھی کہ احزار اس کے کمرے میں آگیا۔

”علیزہ! میری بات سنو پلیز۔“ بے بس سا وہ اس کی طرف بڑھا تھا۔

”تم میری بیوی ہو، میں کچھ غلط نہیں چاہ رہا پلیز مجھے سمجھنے کی کوشش کرو، پلیز۔“

”نہیں.... تم ابھی اور اسی وقت یہاں سے چلے جاؤ پلیز۔“

”میں نہیں جاؤں گا، تم جانتی ہو میں تم پر پورا پورا حق رکھتا ہوں، پھر کیا فرق پڑتا ہے اگر میں رخصتی سے قبل....“

”چپ کر جاؤ احزار پلیز....“ علیزہ کی آواز بھرائی تھی۔

”تمہیں اس بات سے فرق پڑتا ہو یا نہ پڑتا ہو، مگر مجھے فرق پڑتا ہے، کیونکہ میں سمجھتی ہوں ہم جس معاشرے میں رہتے ہیں، وہاں کی روایات کا خیال رکھنا بھی ہمارا فرض ہے۔“

”میں کچھ نہیں جانتا بس، تم میری منکوحہ ہو اور تمہیں میری زندگی کا حصہ بننا ہے۔“ اس نے پھر اسے بے بس کرنے کی کوشش کی تھی وہ بے اختیار رو پڑی۔

”احزار! یہ غلط ہے۔“

مگر احزار نے نہیں سنا، وہ جنونی ہو رہا تھا۔ علیزہ کے احتجاج اور گریز کی اس کے نزدیک کوئی اہمیت نہیں تھی۔ کوئی راستہ نہ پاکر علیزہ اپنے کمرے کے باتھ روم میں جا چھپی۔ اس وقت وہی اس کی بہترین پناہ گاہ تھی۔ لرزتے ہوئے ہاتھوں سے اس نے باتھ روم لاک کیا تھا۔ احزار اس کی اس حرکت پر جیسے پاگل سا ہو

اٹھا۔

"دروازہ کھولو علیزہ! نہیں تو میں کبھی تم سے بات نہیں کروں گا۔"

"مت کرنا، میں خود آج کے بعد تمہاری شکل دیکھنا پسند نہیں کروں گی۔"

"علیزہ! میں کہہ رہا ہوں دروازہ کھولو، نہیں تو اچھا نہیں ہوگا۔"

"آئی ڈونٹ کیئر، تم جاؤ یہاں سے پلیز۔"

"تو ٹھیک ہے اب اس کا رزلٹ بھی دیکھ لینا۔"

وہ غصے میں تھا، علیزہ گھٹنوں میں منہ چھپا کر بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔ احزار عبدالہادی اس کے ساتھ کبھی ایسا بھی کر سکتا ہے اُسے گمان تک نہیں تھا۔

اگلی صبح ناشتے کی میز پر احزار کی آنکھیں سرخ تھیں۔

جبکہ اپنے کمرے میں مقید علیزہ حسین کا وجود بخار میں جل رہا تھا۔ کل پوری رات شدت سے رونے کے سبب، اس کی آنکھیں سرخ اور بوجھل ہو رہی تھیں، جبکہ سر میں شدید درد تھا۔ اس کا بس نہ چلتا تھا کہ وہ احزار عبدالہادی کو گریبان سے پکڑ کر اس کے چہرے پر دو تھپڑ تو ضرور جڑ دیتی۔ باہر لاؤنج سے گاہے بگاہے سب کی آوازیں آ رہی تھیں، اس کی غیر حاضری پر شاید اس کی ماں نے سب کے لیے ناشتہ بنانے کے فرائض سرانجام دیے تھے، وہاں ناشتے کی ٹیبل پر اس کی ماں کے سوا شاید کسی کو بھی اس کی کمی محسوس نہیں ہوئی تھی۔ تبھی وہ بے جان سی بستر میں دبکی پڑی رہی۔ وہاں اس کی فکر کرنے اور اس کا حال پوچھنے کی فرصت کسی کے پاس بھی نہیں تھی، تبھی اس نے محسن صاحب کی آواز سنی تھی۔

"تمہاری کینیڈا جانے کی بات کہاں تک مکمل ہوئی احزار؟"

"کوشش کر رہا ہوں بڑے ابو، اللہ نے چاہا تو جلد بات فائنل ہو جائے گی۔" احزار کا لہجہ اسے بے حد بھاری محسوس ہوا تھا۔

"ہوں، یسریٰ کے لیے ایک لڑکا دیکھا ہے میں نے، ویل آف فیملی سے تعلق رکھنے والا اکلوتا لڑکا ہے، تم ذرا چھان بین کر لو۔"

"ٹھیک ہے کر لوں گا۔"

"طبیعت بہتر نہیں لگ رہی تمہاری، سب ٹھیک تو ہے؟"

"جی سب ٹھیک ہے، مجھے کچھ بات کرنی تھی آپ لوگوں سے۔"

قدرے اکھڑے لہجے میں اس نے کہا تھا اور علیزہ کا دل جیسے اچھل کر حلق میں آ گیا۔ شدید بخار کے باوجود وہ گرم کمبل سے نکل کر کچن میں آئی تھی، تاکہ احزار کی آواز کو صاف سن سکے۔

"ہوں کہو...." احزار کے سنجیدہ انداز پر جہاں سب اس کی طرف متوجہ ہوئے تھے، وہیں حسن صاحب نے بھی ہاتھ میں پکڑا اخبار سائیڈ پر رکھ دیا۔ احزار نے صرف ایک نظر کچن کی طرف دیکھا پھر لب بھینچ کر نگاہ پھیرلی۔

"پاپا! میں کینیڈا جانے سے پہلے شادی کرنا چاہتا ہوں، تاکہ میں یہاں ہر معاملے سے قطعی بے فکر ہو کر وہاں مکمل توجہ کے ساتھ اپنی پڑھائی مکمل کر سکوں، میں درمیان میں لٹک کر نہیں جانا چاہتا۔"

وہی ہوا تھا جس کا علیزہ کو ڈر تھا۔

ناشتے کی ٹیبل کے گرد بیٹھے سب افراد کو احزار کی اس اچانک فرمائش پر حیرانی ہوئی تھی۔ مگر اسے کسی کی پروا نہیں تھی۔

حسن صاحب اب اخبار ایک طرف رکھ کر اس سے کہہ رہے تھے۔

"میں بھی یہی سوچ رہا تھا احزار کہ اباجی کی طبیعت سنبھل کر نہیں دے رہی، ان کی زندگی میں ہی یہ کار خیر انجام پا جائے تو بھلا اس سے اچھی اور کیا بات ہو سکتی ہے، مگر.... علیزہ ابھی اس کے لیے تیار نہیں ہے، وہ پڑھ رہی ہے، ابھی امتحان بھی نہیں ہوئے اس کے، وہ ڈسٹرب ہو کر رہ جائے گی۔"

"پاپا! میں کچھ نہیں جانتا، آپ تائی اماں سے بات

کریں اگر وہ شادی کے لیے تیار ہیں تو ٹھیک ہے، نہیں تو میری طرف سے یہ رشتہ ختم سمجھیں۔"

قطعی دوٹوک انداز میں اپنی بات مکمل کرتے ہی وہ وہاں ایک پل نہیں ٹھہرا تھا۔ جبکہ حسن صاحب اور باقی سب افراد ہکا بکا سے اس کا منہ دیکھتے رہ گئے تھے۔

علیزہ کو لگا جیسے کسی نے اس کے پاؤں تلے سے زمین کھینچ لی ہو، احزار عبدالہادی کے لیے یہ رشتہ اتنا کمزور ہو گا وہ کبھی سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ تب ہی وہیں کچن میں کرسی گھسیٹ کر بیٹھتے ہوئے اس نے اپنے آنسوؤں کو کھل کر بہنے دیا تھا۔

٭ ٭ ٭

احزار عبدالہادی علیزہ حسین کے دل کی پہلی خواہش اور اس کا اولین خواب تھا۔

دونوں ایک ہی گھر میں پل کر جوان ہوئے تھے، بچپن میں وہ اس کے معاملے میں اتنی حساس تھی کہ اگر وہ اسے چھوڑ کر کسی اور بچے کے ساتھ کھیل میں مصروف ہو جاتا، یا گھر میں اس کے سوا کسی اور کو اپنی کوئی چیز دے دیتا تو وہ فوراً منہ بسور کر بیٹھ جاتی تھی، جب کوئی احزار کو اپنے ساتھ کھیلنے کی آفر کرتا تو وہ فوراً اپنے سارے کام چھوڑ کر آتی اور احزار کا ہاتھ پکڑ کر "میلا اے" کہتے ہوئے اپنی طرف کھینچ لیتی۔

بچپن سے سب احزار کے لیے اس کی حرکتوں کو خوب انجوائے کرتے تھے۔ اسی چیز کو مدنظر رکھتے ہوئے منیر احمد صاحب (دادا جی) نے بچپن میں ہی ان دونوں کو نکاح جیسے مضبوط بندھن میں باندھ دیا۔ یہ فیصلہ اس لیے بھی جلد ہو گیا تھا کیونکہ علیزہ کے والد حسین احمد صاحب حیات نہیں تھے اور خود منیر احمد کی طبیعت بھی ٹھیک نہیں رہتی تھی۔

علیزہ کی ماں اور احزار کے گھر والے دونوں ہی اس رشتے پر خوش تھے۔ مگر منیر صاحب کے منجھلے بیٹے محسن اور ان کی بیوی کا منہ بن گیا تھا۔ ان کی تین بیٹیاں تھیں، اور وہ دونوں احزار کو اپنا داماد بنانے کا خواب دیکھ رہے تھے۔ تاہم منیر احمد صاحب نے ان سے مشورہ

بیوٹی بکس کا تیار کردہ
سوہنی ہیئر آئل
SOHNI HAIR OIL

گرتے ہوئے بالوں کو روکتا ہے۔
نئے بال اگاتا ہے۔
بالوں کو مضبوط اور چمکدار بناتا ہے۔
مردوں، عورتوں اور بچوں کے لئے یکساں مفید۔
ہر موسم میں استعمال کیا جاسکتا ہے۔
قیمت -/120 روپے
سوہنی ہیئر آئل 12 جڑی بوٹیوں کا مرکب ہے اور اس کی تیاری کے مراحل بہت مشکل ہیں لہذا یہ تھوڑی مقدار میں تیار ہوتا ہے، یہ بازار میں یا کسی دوسرے شہر میں دستیاب نہیں، کراچی میں دستی خریدا جاسکتا ہے، ایک بوتل کی قیمت صرف -/120 روپے ہے، دوسرے شہر والے منی آرڈر بھیج کر رجسٹرڈ پارسل سے منگوالیں، رجسٹری سے منگوانے والے منی آرڈر اس حساب سے بھجوائیں۔
2 بوتلوں کے لئے ---------- -/300 روپے
3 بوتلوں کے لئے ---------- -/400 روپے
6 بوتلوں کے لئے ---------- -/800 روپے
نوٹ: اس میں ڈاک خرچ اور پیکنگ چارجز شامل ہیں۔
منی آرڈر بھیجنے کے لئے ہمارا پتہ:
بیوٹی بکس، 53-اورنگزیب مارکیٹ، سیکنڈ فلور، ایم اے جناح روڈ، کراچی
دستی خریدنے والے حضرات سوہنی ہیئر آئل ان جگہوں سے حاصل کریں
بیوٹی بکس، 53-اورنگزیب مارکیٹ، سیکنڈ فلور، ایم اے جناح روڈ، کراچی
مکتبہ عمران ڈائجسٹ، 37-اردو بازار، کراچی۔
فون نمبر: 32735021

READINGCORNER
http://readingcornerpk.blogspot.com/

کرنے کے بجائے اپنا فیصلہ سنا دیا تھا جس پہ وہ دونوں خوش نہیں تھے۔

احزار اپنا ایم بی اے مکمل کر چکا تھا اور اب اس کا ارادہ کینیڈا جانے کا تھا۔ تاکہ مزید تعلیم کے ساتھ ساتھ وہ اپنے زور بازو پر اپنے لیے روزگار کے بہترین مواقع حاصل کر سکے۔ علیزہ اپنے ماں باپ کی اکلوتی اولاد تھی۔ اس کے والد حسین احمد صاحب کی شادی اپنے دونوں چھوٹے بھائیوں کے بعد ہوئی تھی، وجہ ان کی ضرورت سے زیادہ بزنس میں توجہ تھی۔ جس کے سبب وہ شادی کرنے میں دلچسپی نہیں لیتے تھے۔

جس وقت علیزہ کی پیدائش ہوئی، محسن صاحب دو بیٹیوں اور حسن صاحب دو چاند سے بیٹوں کے باپ بن چکے تھے، بعد ازاں علیزہ کی پیدائش کے پانچ ماہ بعد محسن صاحب کے ہاں ان کی تیسری بیٹی کومل نے جنم لیا، جبکہ حسن صاحب کی بیگم نے آذر کی صورت ایک اور خوب صورت بیٹے کو جنم دے کر اس گھر کی خوشیوں کو دوبالا کر دیا۔

ثمینہ بیگم البتہ اس گھرانے کو ایسی کوئی خوشی نہیں دے سکی تھیں، علیزہ کے بعد انہوں نے ایک مردہ بیٹے کو جنم دیا اور پھر کبھی ماں نہ بن سکیں۔ حسین صاحب دل کے مریض تھے۔ علیزہ جب سات سال کی تھی، وہ دنیا سے منہ موڑ گئے۔ تب سے منیر صاحب ہی اس کو باپ کا پیار دیتے آئے تھے۔ اب بھی انہوں نے ہی اس کے باپ کی حیثیت سے اس کی زندگی کا فیصلہ کیا تھا، جس پر وہ خود بھی بے حد خوش تھی۔

محسن صاحب کو منیر صاحب سے گلہ تھا کہ ان کی بیٹیاں زیادہ تھیں، پھر علیزہ سے بڑی بھی تھیں، منیر صاحب کو پہلے ان کے بارے میں سوچنا چاہیے تھا۔ مگر انہوں نے ان کی بیٹیوں کے بارے میں سوچنے کے بجائے علیزہ حسین احمد کے بارے میں سوچا تھا اور یہ صریحاً "زیادتی" تھی۔

مگر منیر صاحب نے اس کی پروا نہیں کی تھی۔ احزار اور علیزہ کو نکاح جیسے مضبوط بندھن میں باندھنے کے بعد وہ جیسے بہت پرسکون سے ہو گئے تھے۔

گزرتے وقت کے ساتھ ساتھ جہاں علیزہ اور احزار میں محبت بڑھی تھی، وہیں منیر احمد صاحب کی صحت تیزی سے گرنا شروع ہوئی۔ علیزہ کا زیادہ وقت انہی کے کمرے میں گزرتا تھا، مگر پھر بھی وہ مسلسل بیماری کی زد میں تھے۔ ان کی خواہش تھی کہ وہ اپنی زندگی میں ہی علیزہ کی رخصتی کے فرض سے بھی سبکدوش ہو جائیں۔ مگر علیزہ اس کے لیے تیار نہیں تھی۔ وہ جانتی تھی کہ شادی کے بعد اس کے لیے اپنی تعلیم پر توجہ دینا بہت مشکل ہو جائے گا۔ لہٰذا وہ اس مسئلے کو ٹالتی آ رہی تھی، تاہم اس ضد کے سبب نادرہ حسن کی محبت اس کے لیے پہلے جیسی نہیں رہی تھی۔ کچھ محسن صاحب کی بیگم زرینہ ہر وقت ان کے کانوں میں عجیب عجیب سی باتیں ڈالتی رہتی تھیں، ان کی تینوں بیٹیاں بھی ان کے آگے پیچھے پھرتی رہتی تھیں، مگر انہیں اپنے لائق فائق سے بیٹے کے لیے علیزہ جیسی اپنے آپ میں مگن رہنے والی کم گو لڑکی قطعی غلط انتخاب لگنا شروع ہو گئی تھی۔ وہ اب اس وقت کو اکثر کوستی نظر آتیں، جب انہوں نے اپنے سسر کے فیصلے پر ان کا ساتھ دیا تھا۔

سونے پر سہاگہ احزار کی علیزہ سے بے تحاشا محبت اور ناز برداریوں نے ان کا دل مزید تنگ کیا تھا، وہ اب دل سے اس بندھن کے لیے خوش نہیں تھیں۔

اس روز کے بعد سے احزار کے معمولات بدل گئے تھے۔

وہ صبح دس بجے بیدار ہوتا تھا۔ پھر آفس چلا جاتا، آفس سے واپسی پر کسی دوست کی طرف نکل جاتا، پھر معمول کے مطابق رات گئے تک گھر واپسی کی راہ لیتا، اس کے سارے کام جو علیزہ اپنے ہاتھوں سے سر انجام دیتی تھی، اب کومل نے چپ چاپ اپنے ذمے لے لیے تھے، اس کا کمرا صاف کرنا، اس کے کپڑے پریس کرنا، اسے چائے بنا کر دینا، اس کے لیے کھانا لگانا، بڑی خوشی خوشی وہ یہ سارے کام سر انجام دے رہی تھی، علیزہ جلتے سلگتے دل کے ساتھ سب دیکھتی رہتی اور روتی رہتی۔

اس روز وہ کچن میں رات کا کھانا تیار کر رہی تھی جب کومل نے اچانک اس سے پوچھ لیا۔

"ایک بات پوچھوں علیزہ، مائنڈ تو نہیں کرو گی؟"

وہ تھکی تھکی اور قدرے حیرانی سے اس نے کومل کی طرف دیکھا تھا۔ مگر وہ اپنے کام میں مگن تھی۔ علیزہ نے چپ چاپ برتن خشک کرنے کے بعد کپڑا سائیڈ پر رکھ دیا۔

"پوچھو!"

"ہوں۔ اس رات جب ہم احزار بھائی کے کمرے میں مووی دیکھ رہے تھے، تمہارے اور ان کے بیچ کیا ہوا تھا؟"

علیزہ کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ وہ اس سے ایسا کوئی سوال کرے گی۔ تب ہی اس کے ہاتھ سے کپ چھوٹا تھا اور نیچے زمین پر گر کر کرچی کرچی ہو گیا۔

"کک۔ کچھ نہیں، کیوں؟ تم ایسا کیوں پوچھ رہی ہو؟"

"بس یونہی، تم تو خوامخواہ پریشان ہو گئی ہو، اصل میں اسی رات کے بعد تمہارے اور احزار بھائی کے درمیان بول چال بند ہے۔ گھر میں طرح طرح کی چہ میگوئیاں جنم لے رہی ہیں، امی اور چچی سارا دن سر جوڑے جانے کیا کیا پلان بناتی رہتی ہیں، ادھر احزار بھائی تو ایک دن ناراض نہیں رہ سکتے تھے، اب دیکھو کتنے دن ہو گئے ہیں، مگر انہیں کوئی پروا نہیں۔ وہ شادی پر اڑے ہیں اور تم اپنی ضد پر، پہلے تو ایسا کبھی نہیں ہوا تھا۔"

"ضروری تو نہیں جو پہلے کبھی نہ ہوا ہو، وہ آئندہ بھی کبھی نہ ہو، زندگی میں ہر سانحہ پہلے کبھی نہیں ہوا ہوتا۔"

"وہ تو ٹھیک ہے، مگر تم اس بات کو زیادہ طول مت دو، احزار بھائی جیسے مرد ہر لڑکی کا نصیب نہیں ہوتے، تم بہت خوش نصیب ہو، ورنہ میری مما تو انہیں اپنا داماد بنانے کے لیے، جانے کتنے پیروں، فقیروں کے پاس دھکے کھاتی رہی ہیں۔"

ایک اور چوٹ۔ علیزہ کو لگا جیسے اس کا دم سینے میں گھٹنے لگا ہو۔

"دور کے ڈھول سہانے ہوتے ہیں، قریب آؤ تو کان پھاڑتے ہیں۔"

قدرے خشک لہجے میں کہنے کے بعد وہ وہاں رکی نہیں تھی، کومل لاپروائی سے کندھے اچکا کر رہ گئی۔ علیزہ کمرے میں آنے کے بعد خوب روئی، ایک مان کیا ٹوٹا تھا اسے لگا جیسے وہ خود بھی اندر سے ٹوٹ پھوٹ کر رہ گئی ہو۔

وہاں میں نہیں تھی
فقط خالی پنجرہ دھرا تھا
اور نیم وا ان کواڑوں کی ہر چرچراہٹ میں
حیرانیاں بولتی تھیں
زمیں کی فضا سے کسی نے مجھے باہر دھکیلا
فلک تک مری دسترس کیوں نہیں تھی
نہ جانے میں کب تک خلاء میں بھٹکتی رہی تھی!

اس روز بہت دنوں کے بعد وہ کالج آئی تھی۔ احزار نے جب سے اپنا فیصلہ سنایا تھا۔ گھر میں عجیب سی چہ میگوئیوں نے جنم لینا شروع کر دیا تھا۔ خود اس کی اپنی ماں بھی اسے عجیب الجھی الجھی سی نگاہوں سے دیکھ رہی تھیں، جیسے احزار کے اس فیصلے کے پیچھے کہیں نہ کہیں اس کا کوئی قصور ہو۔

بند کمرے میں رو رو کر تھکنے کے بعد اس روز بالآخر وہ کالج چلی آئی تھی۔ جہاں اس کی عزیز از جان دوست مدیحہ جیسے اسی کی منتظر تھی۔ بریک کے بعد موقع ملتے ہی وہ مدیحہ کے گلے لگ کر رو پڑی۔

"تمہیں ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا علیزہ!"

اس کی پوری روداد، آنسوؤں کے ساتھ سننے کے بعد اس نے کہا تھا۔ علیزہ نے آنسو پونچھ لیے۔

"تو کیا کرتی میں؟ اسے اپنا آپ پیش کر دیتی؟"

"نہیں۔ میں یہ نہیں کہہ رہی، بے شک احزار بھائی نے جو کیا وہ صحیح نہیں تھا، مگر تم نے بھی جو کیا وہ بھی ٹھیک نہیں ہے، تمہیں ان کو بعد میں نرمی سے سمجھانا چاہیے تھا یار، آخر کو نکاح ہوا ہے تمہارا، وہ تمہارے شوہر ہیں اور سب سے بڑی بات کہ تم ان

READING CORNER
http://readingcornerpk.blogspot.com/

سے پیار کرتی ہو۔ کیا اس بات سے فرار ممکن ہے؟"
"نہیں' مگر پیار کا یہ مطلب تو نہیں کہ میں اپنی عزت اور وقار اس شخص کے پاؤں تلے روند کر رکھ دوں کوئی اپنی ہی چیز پر ڈاکہ ڈالتا ہے بھلا؟ مجھے اس کے کردار سے محبت تھی اس کی شخصیت اور دولت سے نہیں۔"
"ٹھیک ہے میں مانتی ہوں ان سے غلطی ہوئی ہے۔ مگر تم اس غلطی کو ایشو مت بناؤ اگر وہ شادی کرنا چاہ رہے ہیں تو ہو جانے دو شادی سب ٹھیک ہو جائے گا۔"
"ہرگز نہیں وہ شخص اس طرح سے میری خواہشات کا خون نہیں کر سکتا۔"
"علیزہ پلیز۔۔۔ تم سمجھتی کیوں نہیں ہو؟"
"کیا سمجھوں میں؟ میری عزت میری حرمت' خاندانی وقار' کسی کی بھی تو لاج نہیں رکھی اس نے اور تم کہتی ہو میں سمجھوں؟ اس نے ایک پل میں مجھے عرش سے فرش پر لا پٹخا ہے مدیحہ' یوں جیسے میری کوئی عزت ہی نہ ہو۔ اس پر ہٹ دھرمی دیکھو اس کی کہ اسے کوئی شرمندگی ہی نہیں ہے' معافی تلافی نام کی کوئی چیز بھی نہیں۔" وہ جذباتی ہو رہی تھی۔
مدیحہ نے کچھ اور لڑکیوں کے قریب چلے آنے پر اسے تسلی دے کر چپ کروا دیا۔
"او کے۔۔۔ تم پریشان مت ہو۔ اللہ سب ٹھیک کرنے والا ہے' چلو ابھی کچھ پیٹ پوجا کرتے ہیں۔"
"میرا دل نہیں چاہ رہا۔"
"تم اٹھو تو دل بھی چاہ جائے گا۔"
وہ بضد تھی اسے بہلانا چاہتی تھی۔ علیزہ دل نہ چاہتے ہوئے اٹھ کر اس کے ساتھ چل پڑی۔

☆ ☆ ☆

منیر صاحب کی طبیعت سنبھل کر نہیں دے رہی تھی۔ علیزہ نے کالج سے چھٹیاں لے لیں۔ ایک طرف احزار فوری رخصتی پر اڑا تھا' دوسری طرف علیزہ فوری رخصتی کے لیے تیار نہیں تھی۔ ان دونوں کے اسی جھگڑے کے سبب جہاں گھر کا ماحول کشیدہ ہو رہا تھا وہیں منیر صاحب کی طبیعت بھی بگڑتی جا رہی تھی۔
ایک چھوٹی سی بات نے نہایت بڑا طوفان کھڑا کر دیا تھا۔ اس کی اپنی ماں احزار کے ساتھ تھیں ان کا کہنا تھا کہ احزار کا مطالبہ ناجائز نہیں ہے' اور اسی بات کی اسے سب سے زیادہ تکلیف تھی۔ عجیب سی الجھن کا شکار ہو کر رہ گئی تھی وہ' کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے؟ پہلی بار اسے دکھ ہوا کہ کسی نے اس سے معذرت کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ اور یہ بات کتنی زیادہ تکلیف دہ تھی کوئی علیزہ حسین سے پوچھتا!
موسم میں خنکی مزید بڑھ گئی تھی۔
وہ گھٹنوں کے گرد بازو لپیٹے خاموش بیٹھی رہی تھی۔ کہاں غلطی ہوئی تھی اس سے کہ گھر میں سب نے اسے مجرم قرار دے دیا تھا۔ اس نے اپنی ماں کو ساری بات بتا دی تھی مگر پھر بھی وہ اس سے ناراض تھیں' کوئی بھی اس سے ڈھنگ سے بات نہیں کر رہا تھا۔
محسن چچا کی بیٹی یسریٰ نے احزار اور اس کی ناراضی سے فائدہ اٹھانے میں قطعی تاخیر نہیں کی تھی' احزار تو قابو نہیں آیا تھا لیکن نادرہ بیگم اپنی سادگی کے باعث بہت جلد زرینہ بیگم اور یسریٰ کے جال میں پھنس گئی تھیں' تبھی انہوں نے احزار پر دباؤ ڈالنا شروع کر دیا کہ اگر علیزہ رخصتی کے لیے نہیں مان رہی تو وہ اسے طلاق دے کر یسریٰ سے شادی کرلے مگر احزار نے سختی سے ان کی بات کو رد کر دیا تھا وہ کسی صورت علیزہ حسین کو آزاد کرنے کے حق میں نہیں تھا۔

☆ ☆ ☆

اس شام اس نے لان میں ثمل اور احزار کو دیکھا تھا۔ ثمل پودوں کو پانی دے رہی تھی' جب باہر سے آتے احزار نے اس کے ہاتھوں سے پائپ چھین کر اس پر پانی ڈالنا شروع کر دیا' وہ احتجاج کرتے ہوئے اسے روک رہی تھی' پائپ اس سے واپس لینے کی کوشش

کر رہی تھی مگر وہ قابو نہیں آ رہا تھا' بے تحاشا ہنستے ہوئے وہ شاید اس بات کو بہت انجوائے کر رہا تھا۔
علیزہ کھڑکی سے پلٹ آئی۔
کمرے میں ٹھنڈک تھی مگر اس کے اندر ایک دم سے حبس بڑھ گیا تھا۔ اگلے روز شام میں وہ تیز بخار کی لپیٹ میں تھی۔ صبح سے پانی کا ایک گھونٹ بھی حلق سے نہیں اتارا تھا نہ ہی وہ کمرے سے باہر نکلی تھی۔ مگر شام میں اپنے اندر کی گھٹن سے تنگ آ کر وہ باہر لاؤنج میں بیٹھی ٹی وی دیکھ رہی تھی تب ہی اس نے کومل کو ثمل کے پاس کچن میں جاتے ہوئے دیکھا تھا۔
"ثمل! احزار بھائی کہہ رہے ہیں اگر تم پانچ منٹ کے اندر اندر تیار نہ ہوئیں تو وہ آئس کریم کا پروگرام کینسل کر دیں گے۔"
"اف نہیں۔۔۔ میں بس ابھی دو منٹ میں آ رہی ہوں۔"
ثمل کی خوشی دیدنی تھی۔ علیزہ نے اپنے گھٹنے سمیٹ لیے۔ اس کا بدن بہت بری طرح سے ٹوٹ رہا تھا۔
"علیزہ۔۔۔ آئس کریم کھانے چلو گی؟"
کومل نے پاس سے گزرتے ہوئے یونہی اس سے پوچھ لیا۔ وہ چپ چاپ نفی میں سر ہلا گئی۔ اگلے پانچ منٹ میں ثمل کمرے سے نکل آئی تھی۔ احزار اپنا چارج پر لگا موبائل لینے اندر آیا تو ثمینہ نے اسے پکار لیا۔
"احزار۔۔۔"
وہ علیزہ کو نظرانداز کیے ہوئے انہی قدموں پر پلٹا تھا۔ "جی بڑی امی۔"
"علیزہ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے' بہت تیز بخار ہے' آذر جانے کب گھر آئے تم باہر جا رہے ہو تو اسے بھی ڈاکٹر کے پاس لیتے جانا۔"
"نہیں امی' مجھے کہیں نہیں جانا' میں ٹھیک ہوں۔" احزار کے کچھ کہنے سے پہلے ہی علیزہ بول اٹھی تھی۔ احزار نے لب بھینچ لیے۔
"آج ثمل کا برتھ ڈے ہے بڑی امی! میں پہلے ہی آفس سے لیٹ آیا ہوں۔ اب اگر ڈاکٹروں کے انتظار میں لگ گیا تو یہ چڑیل ناراض ہو جائے گی' آپ فکر نہ کریں میں آذر کو کال کر کے گھر بلواتا ہوں' وہ لے جائے گا او کے۔"
وہ اپنی توہین کہاں نظرانداز کر سکتا تھا۔ ثمینہ اس کا منہ دیکھتی رہ گئیں' جبکہ وہ انہیں تسلی دیتا' جلدی جلدی قدم اٹھاتا لاؤنج سے باہر نکل گیا تھا۔
علیزہ کی آنکھ سے آنسو پھسل کر اس کے ہاتھ کی پشت پر گرا تھا۔ بہت پرانی بات نہیں تھی جب اس روز وہ لان کی سیڑھیوں پر بیٹھی ٹھنڈ میں پڑھ رہی تھی اور وہ آفس سے آیا تھا۔
"یہاں کیوں بیٹھی ہو؟"
"بس یونہی' کیوں کیا ہوا؟" اس کے لہجے کی خفگی محسوس کر کے وہ مسکرائی تھی۔ جب وہ اس کے مقابل ٹک گیا۔
"تمہیں پتا ہے اس وقت اوس گرنی شروع ہو جاتی ہے' اور تم۔۔۔ تم ذرا سی ٹھنڈ بھی برداشت نہیں کر پاتیں' ابھی بیمار پڑ جاؤ گی اور پھر۔۔۔ خوب جان نکالو گی میری۔"
"ڈائیلاگ تھوڑے جھاڑا کرو۔"
مزے سے اس کی ناک دبا کر وہ پھر مسکرائی تھی۔ جواب میں احزار نے اس کے ہاتھ تھام لیے۔
"جان سے چلا جاؤں گا نا' پھر یقین کرنا میری محبت کا۔" کہنے کے ساتھ ہی اس نے خوشبوؤں میں بسا اپنا کوٹ بھی اس پر ڈال دیا تھا۔
"میرے لیے جان سے جانے والے نہیں ہو تم۔"
"جا بھی سکتا ہوں' قسم سے۔"
فوراً ہی گمبھیر لہجے میں کہتے ہوئے وہ بے اختیار ہوا تھا اور پھر زبردستی اسے اپنے ساتھ اٹھا کر اندر لایا تھا۔
اس سے ناراض ہونے کے باوجود اماں نے اسے آذر کے ساتھ ڈاکٹر کے پاس بھیج کر دم لیا تھا مگر ڈاکٹرز کے پاس بھی ہر مرض کی شفا کہاں ہوتی ہے؟
کچھ مرض بہت گہرے ہوتے ہیں جنہیں اللہ رب

READING CORNER
http://readingcornerk.blogspot.com/

العزت کی پاک ذات کے سوا اور کوئی شفا نہیں دے سکتا۔

☼ ☼ ☼

بڑا دشوار ہوتا ہے ذرا سا فیصلہ کرنا
کہ جیون کی کہانی کو بیاں کی بے زبانی کو
کہاں سے یاد رکھنا ہے کہاں پر بھول جانا ہے
اسے کتنا بتانا ہے کسے کتنا چھپانا ہے
کہاں رو رو کے ہنسنا ہے کہاں ہنس ہنس کے رونا ہے
کہاں آواز دینی ہے کہاں خاموش رہنا ہے
کہاں رستہ بدلنا ہے کہاں سے لوٹ آنا ہے
بڑا دشوار ہوتا ہے ذرا سا فیصلہ کرنا!

اس روز وہ مارکیٹ سے گھر آئی تو اس نے احزار کو نرجس چچی کے پورشن میں دیکھا تھا۔ اسے نسرین سے تھوڑا کام تھا وہ اسی سے ملنے کی غرض سے اس طرف آئی تھی جب اس نے نرجس چچی کو کہتے سنا۔

"علیزہ کے لیے کیا سوچا ہے تم نے؟"

"کچھ نہیں کیوں۔۔۔؟ کچھ سوچنا تھا کیا؟"

احزار کے لہجے میں بے پروائی تھی۔ چچی بے مزہ ہو گئیں۔

"تم بھی پاگل ہو احزار! کب سے رخصتی کے لیے ترلے کر رہے ہو، مگر وہ لڑکی ہے کہ مان کر نہیں دے رہی، پھر بھی تم اس کے انکار کو اہمیت نہیں دے رہے۔ بھئی مانو یا نہ مانو، مجھے تو یہ لڑکی کسی اور میں انٹرسٹڈ لگتی ہے ورنہ تعلیم کوئی ایسا بہانہ نہیں ہے کہ جس کی آڑ لے کر انکار کیا جائے، تم میں کس چیز کی کمی ہے بھلا؟ میں تو کہتی ہوں طلاق دے کر فارغ کرو، پھر پڑھتی رہے بیٹھ کر ساری عمر۔"

"نہیں بڑی امی! یہ فیصلہ اتنا آسان نہیں ہے۔"

"اتنا مشکل بھی نہیں ہے، بس تمہیں اپنا دل ذرا سا مضبوط کرنے کی ضرورت ہے، لازمی نہیں ہے کہ بڑوں کا کیا فیصلہ تم ساری عمر نبھاؤ، تمہارے بڑے ابا کو بڑی خواہش تھی تمہیں اپنا بیٹا بنانے کی۔" رشتوں کے کچھ روپ بہت بھیانک ہوتے ہیں، ڈراؤنے خوابوں سے بھی زیادہ بھیانک، علیزہ حسین کے سامنے بھی اس وقت ایسا ہی ایک روپ آیا تھا۔ احزار کہہ رہا تھا۔

"میں اب بھی آپ کا بیٹا ہی ہوں بڑی امی، پلیز آپ ایسا نہ سوچا کریں۔" احزار کے لہجے میں پھر لاپروائی تھی۔ چچی ٹھنڈی سانس بھر کر رہ گئیں۔

"ہاں بیٹے تو ہو، مگر بیٹی سے منسوب ہو جاتے تو اور بات تھی۔"

"علیزہ بھی آپ کی بیٹی ہی ہے بڑی امی، کیوں دل نہ خراب کیا کریں اپنا، اچھا یہ بتائیں ثمینہ کہاں ہے؟ اس سے آج شام ڈنر کا وعدہ کیا تھا میں نے۔" وہ اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ علیزہ کے قدم من من کے ہو گئے، بمشکل پلٹی تھی۔

"اپنے کمرے میں ہو گی اور کہاں ہونا ہے اس نے۔"

"ٹھیک ہے میں دیکھتا ہوں، آپ کو امی بلا رہی تھیں۔"

جیسے ہی اس نے کہا تھا علیزہ فوراً الٹے پاؤں وہاں سے واپس چلی آئی تھی، اسے لگا جیسے کوئی اس کا دل نوچ رہا ہو۔ اس روز ایک مرتبہ پھر اپنے کمرے میں آ کر اس نے اپنے آنسوؤں کو کھل کر بہنے دیا تھا۔

"علیزہ۔۔۔ کیوں کر رہی ہو تم یہ سب؟"

وہ کچن میں تھی جب ثمینہ فریج کا دروازہ کھول کر کچھ تلاش کرتے ہوئے سنجیدہ لہجے میں بولیں۔ علیزہ نے ہاتھ دھو کر گندھا ہوا آٹا سائیڈ پر رکھ دیا۔

"میں نے کیا کیا ہے امی؟"

"یہ بھی میں بتاؤں کہ تم نے کیا کیا ہے؟ گھر بھر میں ذلیل کر کے رکھ دیا ہے تم نے مجھے، کسی کے سامنے سر اٹھانے کے قابل نہیں چھوڑا، بیٹیاں رحمت ہوتی ہیں۔ لیکن نافرمان اور سرکش ہو جائیں تو زحمت بن جاتی ہیں، فضول کی ضد لگا کر خوب صلواتیں وصول کر رہی ہو گھر کے بڑوں سے، مرے ہوئے رشتوں کی حرمت کا احساس بھی نہیں ہے تمہیں۔" اس کی ماں بہت نرم طبیعت کی حامل خاتون تھیں اس نے انہیں کبھی اتنے غصے میں نہیں دیکھا تھا۔

علیزہ کی آنکھیں پھر بھر آئیں۔

"میں نے ایسا کچھ بھی نہیں کیا ہے امی، میں بس ابھی ذہنی طور پر اس شادی کے لیے تیار نہیں ہوں۔"

"مگر کیوں؟ جب تم اور احزار ایک دوسرے پر جان دیتے ہو تو پھر اب یہ ضد کیوں؟"

"ضد وہ کر رہا ہے امی! میں نہیں۔"

"وہ ضد کیوں کر رہا ہے؟"

"وہ مجھے جھکانا چاہتا ہے، میری حیثیت دکھانا چاہتا ہے، صرف اپنی بات منوانا چاہتا ہے بس۔"

"کیسی بات؟"

اس بار ثمینہ نے قدرے حیرانی سے اسے دیکھا تھا، جواباً علیزہ نے نہ چاہتے ہوئے بھی انہیں ساری بات بتا دی۔

"تمہیں یہ بات پہلے ہی بتانا چاہیے تھی۔"

"مجھ میں ہمت نہیں تھی امی!"

"بہرحال وہ تمہارا شوہر ہے، تمہیں خوامخواہ اس بات کو طول نہیں دینا چاہیے تھا، وہ لڑکا ہے سو گناہ معاف ہیں اسے، مگر تمہارے ساتھ ایسا معاملہ نہیں ہے، میں اب ایک دن کے لیے بھی اس بات کو ٹالنے کے حق میں نہیں ہوں۔"

"مگر امی!"

"کوئی اگر مگر نہیں، تم جانتی ہو جو کچھ اس گھر میں ہو رہا ہے، باپ بھی سر پر نہیں ہے تمہارے، جو تمہارے حق میں آواز اٹھائے، دادا کی حالت سے بھی انجان نہیں ہو، میں رخصتی کی تاریخ طے کر رہی ہوں، تمہیں جو کرنا ہے کرو۔"

حتمی انداز میں بات مکمل کرتے ہوئے وہ پھر کچن میں ٹھہری نہیں تھیں۔ علیزہ بے بسی کی سانس بھر کر رہ گئی!

احزار کے ننھیال میں شادی تھی، مگر وہ نہیں گیا تھا، سر میں شدید درد اور زکام نے اسے جیسے نڈھال کر دیا تھا، تاہم اس کی باقی فیملی اور نرجس چچی اپنی تینوں بیٹیوں کے ساتھ تقریب میں شرکت کے لیے پہنچ گئی تھیں، نرجس چچی کو تو ویسے بھی تقریبات میں شمولیت کا موقع چاہیے ہوتا تھا تاکہ وہ اپنی بیٹیوں کے لیے اچھے گھرانوں کے لڑکے اپنی نظر میں رکھ سکیں۔ منیر صاحب کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی لہٰذا علیزہ نے بھی جانے سے معذرت کر لی، اس کی وجہ سے مسز حسین بھی گھر پر ہی رک گئی تھیں۔

وہ اپنے کمرے میں تھیں جب علیزہ دلیہ بنا کر اپنے دادا جی کے کمرے میں چلی آئی، ان کے چہرے پر اس وقت عجیب سی تکلیف کے آثار تھے۔ وہ دلیے کا پیالہ سائیڈ ٹیبل پر رکھ کر ان کے قریب چلی آئی تھی۔

"دادا جی۔۔۔ آپ ٹھیک تو ہیں ناں؟"

"ہوں۔۔۔" ایک پل کے لیے آنکھیں کھول کر انہوں نے اسے دیکھا تھا اور پھر پلکیں موند لیں۔

"احزار کہاں ہے؟" کچھ دیر بعد قدرے دھیمے لہجے میں انہوں نے پوچھا تھا۔

"وہ۔۔۔ وہ اپنے کمرے میں ہے دادا جی! ابھی گھر آیا ہے۔"

"اسے میرے پاس بلا کر لاؤ، کہو دادا جی بلا رہے ہیں۔" پلکیں موندے انہوں نے حکم جاری کیا تھا۔ علیزہ مشکل میں پڑ گئی۔

"دادا جی، وہ شاید سو رہا ہے، آپ مجھے بتا دیں کیا کام ہے؟"

"تم نہیں۔۔۔ اسے بلا کر لاؤ ابھی۔"

اسے لگا جیسے وہ بہت مشکل سے بول پا رہے ہوں۔ علیزہ عجیب سی کشمکش کی شکار سر ہلا کر کمرے سے نکل آئی۔

احزار حسن کے کمرے کی طرف بڑھتے ہوئے اس کا ایک ایک قدم من من بھر کا ہو رہا تھا۔ وہ اس شخص کی شکل دیکھنے کی روادار نہیں تھی، کجا کہ اسے مخاطب کرتی، مگر دادا جی کی طبیعت کے پیش نظر وہ مجبور ہو گئی تھی۔

احزار کا کمرا لاک نہیں تھا، دروازے کے ہینڈل پر ذرا سا دباؤ ڈالنے کے بعد وہ کمرے میں داخل ہو گئی تھی

READING CORNER
http://readingscorner.blogspot.com

سامنے ہی وہ کمبل میں لپٹا سو رہا تھا۔ سامنے ٹیلی وژن کی اسکرین پر کوئی انگلش مووی لگی تھی۔ وہ اس کے بیڈ کے قریب چلی آئی تھی۔

"احزار۔۔۔"

وہ جو تکیہ بانہوں میں دبائے' بائیں کروٹ پر بے خبر سو رہا تھا۔ ٹس سے مس تک نہ ہوا' تب دوسری اور تیسری بار بھی بلند آواز سے پکار کر دیکھ لیا' مگر اس نے آنکھیں نہیں کھولیں۔ ہلکی سی بڑھی ہوئی شیو کے ساتھ اس کا مرجھایا مرجھایا سا چہرہ اس کے اندر کی بے سکونی کا پتا دے رہا تھا۔

"احزار۔۔۔؟" تیسری اور چوتھی بار پکارنے کے بعد بالآخر مجبور ہو کر اس نے اس کا بازو ہلایا تھا اور تب ہی وہ چونکا تھا جب اس نے پٹ سے آنکھیں کھولتے ہوئے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

"ہوں بولو۔ کیا بات ہے؟"

وہ ٹھٹک کر پیچھے ہٹی تھی۔

"تم بہت فضول شخص ہو احزار' مجھ سے غلطی ہوئی جو دادا جی کے حکم پر تم جیسے اسٹوپڈ انسان کو بلانے چلی آئی۔"

"بکواس بند کرو' بیوی ہو تم میری' یہ میرا حق ہے۔"

ایک دم سے گرفت ڈھیلی کر کے وہ خود بھی بستر سے نکل آیا۔ علیزہ معطل حواس کے ساتھ فوراً" سے پیشتر اس کے کمرے سے نکلی تھی۔ وہ دادا جی کے کمرے میں آئی تو احزار بھی اس کے پیچھے ہی چلا آیا۔

تب ہی وہ وہاں سے بھی نکل آئی تھی' مگر کمرے کی کھڑکی سے اس نے دیکھا تھا کہ دادا جی احزار کا ہاتھ تھامے بہت مشکل سے اسے کچھ کہہ رہے تھے اور وہ اثبات میں سر ہلاتا بار بار ان کے ہاتھ تھپتھپاتا ہوا جیسے انہیں کچھ یقین دلانے کی کوشش کر رہا تھا۔ پھر اس نے جھک کر دادا جی کے ہاتھ کو بوسہ بھی دیا۔

علیزہ کھڑکی سے پلٹ کر کچن میں آگئی۔

جانے دادا جی اتنی خراب طبیعت کے باوجود اس شخص سے کون سے راز و نیاز کر رہے تھے۔ اس نے فریج سے سبزی نکالی اور کاٹنے بیٹھ گئی' تبھی وہ کچن میں آیا تھا۔

"تحمل اور دیسری لوگ نظر نہیں آرہے' کیا وہ بھی تائی ماں کے ساتھ گئی ہیں۔" اس کے کندھے سے کندھا ملا کر وہ عین برابر میں آبیٹھا تھا۔ علیزہ خاموش رہی۔

"کچھ پوچھا ہے میں نے؟"

"مجھے نہیں پتا' میں تمہارے کسی سوال کا جواب دینے کی پابند نہیں ہوں؟"

"کیوں؟"

"تمہیں پتا ہو گا کہ کیوں؟"

اس کی آنکھوں میں غصہ تھا' احزار دیکھتا رہ گیا۔

"کیوں کر رہی ہو ایسا؟"

"میں کچھ نہیں کر رہی' تم جاؤ یہاں سے۔"

"تم پہلے ایسی نہیں تھیں علیزہ؟"

"تم بھی ایسے نہیں تھے پہلے۔"

"کیوں کون سی تبدیلی دیکھی ہے تم نے مجھ میں؟"

وہ بات سے بات نکال رہا تھا۔ علیزہ جھنجلا گئی۔

"احزار پلیز' تم جاؤ یہاں سے' مجھے تم سے کوئی بات نہیں کرنی۔"

"مگر کیوں' ایسا کیا جرم کر دیا ہے میں نے جو ابھی تک تمہارا دل صاف نہیں ہوا۔ میرے دوست کی صرف منگنی ہوئی ہے' مگر اس کی منگیتر خود کال کر کے اسے بلاتی ہے اور ایک میں ہوں' جس کی شرعی اور قانونی بیوی اسے قریب نہیں پھٹکنے دیتی۔"

وہ اسی بات پر اڑا تھا۔ علیزہ جو اس سے احساس ندامت کی توقع کر رہی تھی مزید تپ اٹھی۔

"بڑا فخر ہے تمہیں اپنے دوست اور اس کی منگیتر پر؟ جہنم کی آگ بھر رہے ہیں اپنے دامن میں' خود اپنے آپ کو دھوکا دے رہے ہیں وہ' اپنے ماں باپ کو نہیں' مگر میں ان لوگوں میں سے نہیں ہوں' کیونکہ میرا ایمان اور ضمیر ابھی مردہ نہیں ہوا ہے۔ یہ سچ ہے کہ میں نے تم سے محبت کی ہے' بے حد بے تحاشا' یہ بھی سچ ہے کہ تم میرے وجود پر پورا پورا حق رکھتے ہو۔

READING CORNER
http://readingcornerpk.blogspot.com

کیونکہ میں تمہارے نکاح میں ہوں مگر یہ حق ابھی میری ماں نے تمہارے سپرد نہیں کیا ہے۔ میں نہیں چاہتی کہ کل کو میری ماں جب مجھے تمہارے ساتھ رخصت کرے تو اس کے پیچھے ان کی کوئی مجبوری ہو ان کی نظریں ندامت اور شرم سے جھکی ہوئی ہوں اور تم ___ تم تمہارے دل میں میرے لیے کوئی شوق نہ ہو۔"

احزار کے شکوے پر وہ بھی خاصی جذباتی ہو گئی تھی۔ وہ چپ چاپ اسے دیکھتا رہا۔

"ایم سوری احزار! میں کوئی ایم نہیں ہوں لیکن میں تمہاری زندگی میں پوری روایتوں اور بزرگوں کی دعاؤں کے ساتھ آنا چاہتی ہوں۔"

"تو ٹھیک ہے پھر رخصتی کروالیتے ہیں کیوں نہیں مان رہی ہو تم۔"

"صرف چند ماہ کی مہلت مانگی ہے میں نے۔"

"میں چند ماہ انتظار نہیں کر سکتا۔"

"مجھے تم پر بہت مان تھا احزار۔"

"مجھے بھی بہت مان تھا تم پر تم نے لاج رکھی میرے مان کی؟ جب سے وہ بات ہوئی ہے پاس بیٹھنا تک چھوڑ دیا ہے تم نے کہاں وہ آگے پیچھے پھرنا میری ہر ضرورت کا خیال رکھنا ذرا سی طبیعت خراب ہونے پر رات رات بھر جاگنا میں نے سفر پر جانا تو نوافل پڑھ پڑھ کر میری سلامتی کی دعائیں مانگنا گھر واپسی پر لیٹ ہو جانا تو نیند کو پس پشت ڈال کر صرف میرے لیے جاگنا کیا تھا وہ سب؟"

وہ جذباتی ہوا تھا۔ علیزہ کی آنکھوں سے دو آنسو ایک ساتھ ٹپک پڑے۔

"محبت!" بہت ٹھہرے ہوئے لہجے میں سر جھکا کر جواب دیا تھا اس نے۔

"کیا اب محبت نہیں رہی؟"

"نہیں۔"

"سچ کہہ رہی ہو؟"

"ہاں!"

"ٹھیک ہے، نمل آئے تو اسے کہنا ایک کپ چائے بنا کر میرے کمرے میں بھیج دے۔"

علیزہ کے رخ پھیرنے پر لب بھینچتے ہوئے اس نے کہا تھا اور اگلے ہی پل کچن سے نکل گیا۔ علیزہ کتنی ہی دیر جامد دماغ اور گھٹی ہوئی سوچوں کے ساتھ وہیں بیٹھی رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

احزار کا کینیڈا کے لیے ویزا ہو گیا تھا نہ صرف ویزا آگیا تھا بلکہ اس کی سیٹ بھی کنفرم ہو گئی تھی۔

موسم بدل رہا تھا۔ گھر میں یسریٰ کے رشتے کی بات چل رہی تھی۔ احزار کے ننھیال سے عباس کے لیے رشتہ آگیا تھا اور مسز محسن کے پاؤں جیسے زمین پر نہیں لگ رہے تھے۔ خود یسریٰ بھی سارے دن ہواؤں میں اڑتی محسوس ہوتی تھی۔

علیزہ کے پیپرز قریب تھے مگر اس کے باوجود مسز حسین نے اس کی رخصتی طے کر دی تھی۔ اپنے کمرے سے احزار عبدالہادی کے کمرے تک کا سفر اس کے لیے کسی پل صراط سے کم نہیں تھا۔ منیر صاحب محسن صاحب اس کی ماں سب خوش تھے مگر وہ چپ تھی۔ احزار عبدالہادی کی ضد نے جیسے اسے اندر سے تکلیف پہنچائی تھی مگر اس تکلیف سے بھی زیادہ تکلیف اسے اس وقت ہوئی جب وہ کمرے میں آیا۔ چپ چپ سا بے حد نڈھال وہ کمرا لاک کرنے کے بعد بہت خاموشی سے اس کے پاس آبیٹھا تھا۔

"کیسی ہو؟" کافی دیر کی خاموشی کے بعد بہت بوجھل سے لہجے میں اس نے پوچھا تھا۔ جب علیزہ نے خود ہی گھونگھٹ اٹھا دیا۔

"ایک ہارا ہوا انسان کیسا ہو سکتا ہے؟"

"تم ہاری نہیں ہو ہار وہ ہوتی ہے جب کسی چاہنے والے کو دھتکار دیا جائے دیکھو کتنی خوب صورت لگ رہی ہو تم اس وقت ___ یہ چوڑیاں یہ سنگھار یہ سب میرے لیے ہے ناں؟"

علیزہ کی چوڑیوں سے کھیلتے ہوئے وہ جس انداز میں بات کر رہا تھا علیزہ کا دل ایک انجانے سے خوف سے دھڑک اٹھا۔

"بتا نہیں تم واقعی اتنی خوب صورت ہو یا صرف مجھے لگتی ہو مگر یہ سچ ہے علیزہ میں نے تمہارے سوا کسی کو اپنے دل کا پتا نہیں دیا۔"

کچھ لمحوں کی خاموشی کے بعد پھر اس کی آواز گونجی تھی۔

"دیکھو تمہاری ماں نے آج تمہیں پورے فخر اور مان سے رخصت کر کے میرے حوالے کیا ہے اور میں تمہیں پوری روایتوں کے ساتھ دنیا کے سامنے اپنا بنا کر لایا ہوں مگر۔"

بہت بوجھل لہجے میں بولتے بولتے ایک دم سے وہ رکا تھا جب علیزہ نے فوراً سر اٹھا کر اسے دیکھا۔

"مگر؟"

"مگر اب وہ دل رہا ہے نہ دل کی خواہش۔"

وہ سنجیدہ تھا۔ علیزہ کا دل جیسے کسی نے مٹھی میں بھینچ ڈالا۔ اس کی آنکھیں ساکت رہ گئی تھیں مگر احزار نے پروا نہیں کی بنا اس کے حسن کو خراج تحسین پیش کیے وہ کپڑے تبدیل کرنے کے بعد سو گیا تھا۔ علیزہ وہ پتھر بنی بیٹھی رہی۔

اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ کبھی احزار اور اس کے بیچ اتنے فاصلے بھی بڑھ جائیں گے کہ دونوں ایک ہی بستر پر ہوتے ہوئے بھی ایک دوسرے سے صدیوں کی مسافت پر ملیں گے۔

اگلے روز رات دو بجے احزار کی فلائیٹ تھی۔ علیزہ کمرے سے ہی نہیں نکلی اس کا دل جیسے پتھر ہو گیا تھا اس وقت اس میں کسی کا بھی سامنا کرنے کی ہمت نہیں تھی۔ نہ دادا جی کا نہ اپنی ماں کا نہ زرینہ چچی اور ان کی بیٹیوں کا۔ سردی کی بڑھتی ہوئی شدت نے جیسے اس کے احساسات منجمد کر دیے تھے۔

احزار عبدالہادی جیسے شخص کو سمجھنا اتنا آسان کہاں تھا؟

کوئی فریاد تیرے دل میں دبی ہو جیسے
تو نے چپکے سے کوئی بات کہی ہو جیسے
ایک لمحے میں سمٹ آیا ہے صدیوں کا سفر
زندگی تیز ___ بہت تیز چلی ہو جیسے

یسریٰ کے رشتے کی بات فائنل ہو گئی تھی اور اب زرینہ بیگم کی خواہش تھی کہ منیر صاحب کی زندگی میں ہی یسریٰ بھی اپنے گھر رخصت ہو جائے تاکہ دادا کی طرف سے جو کچھ علیزہ کو ملا وہ یسریٰ کو بھی ملے۔

احزار کو کینیڈا گئے چار ماہ ہونے کو آئے تھے اور ان چار ماہ میں ایک بار بھی اس نے علیزہ سے الگ کر بات نہیں کی تھی۔ سیل فون اور اسکائپ دونوں پر وہ صرف اپنی ماں دادا یا یسریٰ نمل لوگوں سے زیادہ بات کرتا تھا علیزہ پاس بیٹھی منتظر رہتی کہ وہ اسے بلائے گا۔ مگر ہر بار اس کا یہ گمان دکھ میں بدل جاتا تھا۔

اس کی چپ اور اداسی کو دیکھتے ہوئے مسز حسین نے اسے دوبارہ کالج جوائن کرنے کی اجازت دی تھی۔ مگر عجیب بے کلی تھی کہ اب کالج میں بھی دل نہیں لگتا تھا جتنا وہ احزار کو ذہن سے جھٹکنے کی کوشش کرتی تھی اتنا ہی وہ اور اس کی یادیں اس کی سوچ کے دریچوں میں در آتی تھیں۔ اوپر سے آج کل یہ سننے میں آرہا تھا کہ احزار نے کینیڈا میں کسی انڈین مسلمان لڑکی سے فرینڈ شپ کر لی ہے اور دونوں بہت تیزی سے ایک دوسرے کے قریب ہو رہے ہیں گھر بھر میں یہ خبر پھیلانے والی نمل تھی جبکہ اسے ہنسی میں اڑا کر مشکوک کرنے والا خود احزار حسن تھا۔

علیزہ حسن کے اندر جیسے کوئی الاؤ دہکنے لگا جس میں اس کی ایک ایک سانس جل رہی تھی۔ بے گناہ ہوتے ہوئے بھی اس شخص نے اسے سولی پر لٹکا دیا تھا۔ مگر وہاں اس کا درد سمجھنے والا کوئی نہیں تھا۔

نمل نے احزار کے بعد اب آزر میں دل چسپی لینی شروع کر دی تھی اور یہاں اسے ناکامی کا منہ نہیں دیکھنا پڑا تھا۔ آزر نے نہ صرف اس کی محبت کا جواب محبت سے دیا تھا بلکہ اپنی ماں سے کہہ کر بات بھی پکی کروالی تھی۔ جس پر زرینہ بیگم کا سالوں پرانا غصہ قدرے کم ہوا تھا۔

علیزہ کی رخصتی کی طرح یسریٰ کی شادی کا معاملہ

بھی جٹ منگنی پٹ بیاہ کے مصداق طے ہو گیا تھا۔ یسریٰ کا میاں کئی سال دوبئی میں رہنے کے بعد اب پاکستان میں سیٹل ہو گیا تھا۔ بہن بھائی سب شادی شدہ تھے اور ماں باپ کی رحلت ہو چکی تھی' نرجس بیگم کو وہی یسریٰ کے قابل لگا تھا کیونکہ یسریٰ کے مزاج میں بہت ترشی تھی۔

علیزہ کو یسریٰ کا شوہر زیادہ اچھا نہیں لگا تھا۔ احزار نے بھی اس شادی میں شرکت سے معذرت کرلی تھی۔ تاہم اس نے کینیڈا سے بہت قیمتی تحائف بھجوائے تھے۔ ایک بات جو علیزہ نے محسوس کی تھی۔ وہ یسریٰ کے شوہر کاشف کے کردار کی کمزوری تھی' یسریٰ سے زیادہ وہ تحمل اور کومل کی کمپنی کو انجوائے کرتا تھا۔ علیزہ کے ساتھ بھی اس نے ایک دوبار ضرورت سے زیادہ فری ہونے کی کوشش کی تھی۔ مگر علیزہ نے اس کی کوشش کو کامیاب نہیں ہونے دیا۔ وہ جتنا خوش شکل تھا اتنا ہی عاشق مزاج اور رومینٹک تھا۔

یسریٰ شادی کے بعد تقریباً" روز ہی ادھر پڑاؤ ڈالے رکھتی تھی' تبھی اس کا شوہر علیزہ کے ارد گرد منڈلاتا رہتا تھا' کبھی کچن میں' کبھی چھت پر' کبھی کمرے میں' جہاں اکیلا پاتا گھیر لیتا' وہ اس کی حرکتوں سے سخت عاجز تھی۔ مگر دادا جی کے علاوہ اور کسی سے اس کے بارے میں کچھ بھی نہیں کہہ سکتی تھی۔ کیونکہ وہ جانتی تھی اگر اس نے اس بارے میں کسی سے کچھ کہا تو کوئی اس کی بات پر یقین نہیں کرے گا' سب اسے ہی مورد الزام ٹھہرائیں گے۔

اس روز وہ کالج سے گھر آئی تو سب لاؤنج میں ہی پڑاؤ ڈالے بیٹھے تھے۔ کاشف بھی وہیں موجود تھا۔ وہ سب کو سلام کرتی اپنے کمرے میں چلی آئی' تبھی اس نے کاشف کی آواز سنی تھی۔

"یسریٰ یار' تم لوگ اس لڑکی کو اس کے شوہر کے پاس کیوں نہیں بھجوا دیتے' آج کل زمانہ نہیں ہے' یوں شادی شدہ جوان لڑکیوں کو اکیلے گھر سے باہر بھیجنے کا۔"

"کیوں کیا ہوا؟ یہ تو ہمیشہ سے اکیلی ہی جاتی ہے کالج۔" یسریٰ کی آواز آئی تھی۔ علیزہ کے ہاتھ دوپٹہ اتارتے اتارتے رک گئے۔

"ہوں' پھر تو یقیناً" خوب آگے چلی گئی ہوگی کہانی۔"

"کیسی کہانی؟"

"بھئی' یہ تو تم اپنی کزن سے ہی پوچھو' آج مارکیٹ میں کسی لڑکے کے ساتھ دیکھا تھا میں نے اسے۔"

"کیا؟"

"جی ہاں' میری بات کا یقین نہیں تو بے شک بلا کر پوچھ لیں' اس نے بھی مجھے دیکھ لیا تھا۔" وہ جتنی ڈھٹائی اور اعتماد سے بات کر رہا تھا۔ ثمینہ کے دل پر جیسے بجلیاں سی گر پڑی تھیں۔ تب ہی علیزہ شدید غصے میں اپنے کمرے سے باہر آئی تھی۔

"کاشف بھائی! خدا کا خوف کریں میں وہاں اکیلی نہیں تھی میری دوست بھی ساتھ تھی۔"

"میں نے کسی لڑکی کو نہیں دیکھا۔"

"آپ جھوٹ بول رہے ہیں۔"

"بکواس بند کرو اپنی' میرے دماغ کو کیا ضرورت ہے جھوٹ بولنے کی' اس نے جو کھلایا ہے' کبھی نہیں بولا' یہ جھوٹ بتاؤ۔"

"صحیح کہہ رہی ہیں امی' ایک تو چوری اوپر سے سینہ زوری۔" ماں کے چیک کروانے پہ یسریٰ کا پارہ بھی ہائی ہوا تھا۔ علیزہ کٹ کر رہ گئی۔

"یہ جھوٹ بول رہے ہیں' میں وہاں اپنی دوست کے ساتھ گئی تھی کیونکہ ہمیں اپنی ایک دوست کے لیے گفٹ خریدنا تھا اور میری دوست کے بھائی نے ہمیں کالج سے پک کر کے بازار ڈراپ کر دیا۔"

"تمہیں ضرورت کیا تھی کالج سے بازار جانے کی' وہ بھی گھر والوں کو بتائے بغیر۔" یہ سوال ثمینہ کی طرف سے تھا۔ علیزہ کی آنکھیں بھر آئیں۔

"دوست اصرار کر رہی تھی امی اچانک پروگرام بن گیا تھا۔"

"شریف گھرانوں کی لڑکیاں یوں دوستوں کے اصرار پر اچانک پروگرام بنا کر کہیں بھی نہیں نکل جاتیں' خدانخواستہ کچھ بھی ہو سکتا تھا ہم تو کسی کو منہ دکھانے لائق نہ رہتے۔"

زرینہ بیگم پھر چہکی تھیں۔ مسز حسین نے دکھ سے منہ پھیر لیا۔

"میں کسی کے ساتھ گھر سے بھاگی نہیں تھی چچی جو آپ کسی کو منہ دکھانے لائق نہ رہتیں۔"

"یہی حالات رہے تو بھاگ بھی جاؤ گی ایک دن' ہونہہ یہ تم جیسی لڑکیاں ہی ہوتی ہیں جو ماؤں کی آنکھوں میں دھول جھونک کر ان کی بے خبری کا فائدہ اٹھا کر' روز نئے چاند سورج چڑھاتی ہیں اور ان کی بے خبر ماؤں کو پتا تک نہیں چلتا' شوہر تو جان چھڑا کر بھاگ گیا۔ آج گھر کے داماد نے دیکھا ہے کل کو لوگ دیکھ کر باتیں کریں گے پھر کیا جواب دیں گے انہیں بتاؤ۔"

علیزہ کا دل کٹ کر رہ گیا۔

"جن کے اپنے آگے بیٹیاں ہوں وہ کسی کی بیٹیوں کے بارے میں ایسی بات نہیں کرتے چچی۔"

"بکواس بند کرو تم جیسی بیٹیاں پیدا کرنے سے بہتر ہے' بندہ ساری عمر بانجھ رہے۔" ان کی زبان کے آگے خندق تھی۔ کاشف سر جھکائے زیر لب مسکرا رہا تھا۔

"ابا جی کو بھی جانے کیا ہو گیا تھا کہ ضد ہی پکڑ لی ورنہ اللہ جانتا ہے میں ایک فیصد بھی اس شادی کے حق میں نہیں تھی' باپ کا سایہ سر پر نہ ہو تو اولاد یونہی خود سر ہو کر رہ جاتی ہے' ماشاء اللہ پڑھا لکھا خوب صورت بیٹا ہے میرا' کس چیز کی کمی تھی اس میں' ہونہہ مجھے اس کے لیے کوئی اچھے خاندان کی مالدار لڑکی نہ ملتی' اللہ معاف کرے بہت بڑی زیادتی کی ہے ابا جی نے ہمارے ساتھ۔"

نازو جو اب تک خاموش بیٹھی تھیں اس بار سنگ باری میں انہوں نے بھی اپنا حصہ ڈالا تھا۔ علیزہ کو لگا جیسے کسی نے ڈھیر سارے کانچ اس کے اندر اتار دیے ہوں۔ لفظوں کے دانت کتنے نوکیلے ہوتے ہیں یہ علیزہ حسین نے اس وقت جانا تھا۔ اسی روز اسے پتا چلا تھا کہ گھر میں بزرگ' بوڑھے سایہ دار درخت کی مانند ہوتے ہیں جن سے امن کی فاختاؤں کی وابستگی ہمیشہ رہتی ہے' یہ پیڑ جب کٹ جاتے ہیں تو امن کی فاختائیں بھی اڑ جاتی ہیں اس کے گھر میں بھی یہی ہو رہا تھا۔

اس وقت وہ کسی گناہ گار مجرم کی طرح ہر الزام پر خاموش سر جھکائے اپنے کمرے میں واپس چلی آئی تھی۔ ساس کو ماں کے برابر درجہ دیا جاتا ہے۔ مگر اس وقت اس ماں نے اس کا نازک سا دل ادھیڑ ڈالا تھا۔ ان دو عورتوں کے بیچ اس کی اپنی ماں سر جھکائے خاموش کھڑی رہی تھی۔ اس ماں کے پاس شاید اس وقت اپنی پارسا بیٹی کے حق میں کچھ کہنے کے لیے تھا بھی نہیں۔ جبکہ اپنے کمرے میں چت لیٹے منیر صاحب نے اپنی آنکھیں اذیت سے بند کر لی تھیں۔

☆ ☆ ☆

اس روز موسم بہت سرد تھا' اوپر سے بارش کا بھی امکان تھا۔

دیر تک کچن میں رات کا کھانا تیار کرنے کے سبب وہ اوپر چھت پر پھیلائے کپڑوں کو بھول ہی گئی۔ مسز حسین پچھلے تین روز سے تیز بخار میں پھنک رہی تھیں' جبکہ دادا جی کی طبیعت بھی خطرناک حد تک خراب تھی۔ اتنی زیادہ ٹینشن میں علیزہ کو کسی چیز کا ہوش ہی نہیں تھا۔

کھانا لگ گیا تھا اور سب نے کھا بھی لیا تھا' تبھی بارش شروع ہو گئی تو وہ کچن سمیٹنے کے بعد اوپر چھت پر چلی آئی' اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ وہاں کاشف ہوگا۔ کیونکہ یسریٰ کے مطابق وہ واک کے لیے گھر سے باہر نکلا تھا' تبھی وہ بے خوف اوپر چلی آئی تھی' مگر اوپر پہنچ کر جیسے ہی اس نے جلدی جلدی کپڑے تار سے اتارنے کی کوشش کی' وہ ٹیرس کی طرف سے نکل کر اس کے عین پیچھے آ کھڑا ہوا۔

"کپڑوں کی اتنی فکر' اور انسانوں کا کوئی خیال ہی نہیں' واہ۔"

وہ چونکی تھی اور اس کا دل دھک سے رہ گیا۔ کاشف

اس کے عین پیچھے کھڑا مسکرا رہا تھا۔ وہ باقی کے کپڑے تار پر ہی چھوڑ کر تیزی سے پلٹی تھی مگر اس نے آگے بڑھ کر اس کا راستہ روک لیا۔

"اتنی جلدی کس بات کی ہے، میں کوئی کھا تو نہیں رہا تمہیں۔ دیکھو کتنی اچھی بارش ہو رہی ہے۔ چلو ٹیرس پر چلتے ہیں، تھوڑی سی انجوائے منٹ ہو جائے گی۔"

"شٹ اپ!" علیزہ کا چہرہ سرخ ہوا تھا مگر کاشف نے پروا نہیں کی۔

"تم غلط کیوں سمجھتی ہو مجھے، [illegible] میں تمہیں پسند کرتا ہوں علیزہ، دل سے قدر کرتا ہوں تمہاری، کیوں بندھی ہو اس شخص کے نام کے ساتھ، وہ تم جیسی پیاری، حسین و جمیل لڑکی کے قابل ہی نہیں ہے۔" لگاوٹ سے کہنے کے ساتھ ہی اس نے علیزہ کا ہاتھ پکڑ کر اسے اپنی طرف کھینچنے کی کوشش کی تھی۔ جب بے ساختگی میں اس نے فوراً اس کے گال پر زوردار تھپڑ جڑ دیا۔

"چھوڑو میرا ہاتھ۔"

"چھوڑوں گا مگر اس تھپڑ کا بدلا چکانے کے بعد۔"

وہ موقع تھا اور اب اسے اپنی اصلیت دکھا رہا تھا۔ علیزہ نے بات بگڑنے کے ڈر سے چیخنا مناسب نہیں سمجھا۔ وہ صرف اس سے بچنے اور خود کو چھڑا کر بھاگنے کی کوشش کر رہی تھی۔ جب یسری نے سیڑھیوں کے دہانے پر کھڑے اسے کاشف کے اوپر جھکے دیکھ کر چیخنا شروع کر دیا۔ پل کی پل میں سارا گھر وہاں چھت پر جمع ہو گیا تھا، کسی کو بھی جیسے اپنے بھیگنے کی پروا نہیں تھی۔

کاشف نے جو یسری کو چیختے ہوئے دیکھا تو فوراً علیزہ کو چھوڑ کر اس کے قریب چلا گیا۔

"میں یہاں اس گھر میں اب ایک پل بھی نہیں رہ سکتا یسری! یہ لڑکی شوہر کی جدائی میں پاگل ہو رہی ہے۔"

کمال ہوشیاری سے کام لیتے ہوئے بجائے شرمندہ ہونے یا گھبرانے کے وہ الٹا یسری پر چڑھ دوڑا تھا۔

جواب میں وہ علیزہ پر ٹوٹ پڑی۔

"گھٹیا، بے غیرت، ذلیل لڑکی کوئی حیا نام کی چیز ہے تم میں کہ نہیں۔"

"گھٹیا، بے غیرت، ذلیل تمہارا شوہر ہے، میں نہیں۔ اسے کیوں نکیل ڈال کر نہیں رکھتیں تم۔" یسری کے تھپڑ کے جواب میں وہ چلائی تھی کہ جب کاشف نے آگے بڑھ کر اسے تھپڑ رسید کر دیا۔

"حد ہوتی ہے بے غیرتی اور ڈھٹائی کی، اس سے پوچھو یسری، جب اسے پتا تھا کہ میں اوپر ٹیرس پر نہانے کے لیے آیا ہوں تو یہ اتنی بارش میں یہاں میرے پیچھے کیوں آئی؟ کیوں زبردستی روکا ہوا تھا اس نے مجھے؟ اس سے پوچھو اس نے مجھے کیوں کہا کہ میں تمہیں طلاق دے کر اس سے شادی کر لوں، کیوں کہا اس نے مجھے کہ میں اسے اچھا لگتا ہوں، احراز سے زیادہ خوب صورت لگتا ہوں۔"

وہ کتنا بڑا مکار اداکار تھا، علیزہ کو حقیقتاً اس وقت اندازہ ہوا تھا۔

"یہ جھوٹ بول رہا ہے یسری آپی، مجھے قطعی خبر نہیں تھی کہ یہ اوپر چھت پر موجود ہے، میں تو صرف یہ کپڑے اتارنے آئی تھی۔"

"ہاں کپڑے ہی تو اتارنے آئی تھیں تم، مگر میں نے تمہیں کامیاب نہیں ہونے دیا۔ دادا جی کے بار بار بلانے پر یہاں تمہیں دیکھنے اوپر چھت پر چلی آئی۔"

جتنا زہر اس کے شوہر کے جھوٹ میں تھا اس سے کہیں زیادہ خاردار اس کے اپنے الفاظ تھے۔ نرجس چچی نے جو یہ تماشا دیکھا تو آگے بڑھ کر پے در پے کئی تھپڑ اسے رسید کر دیے۔

علیزہ سچ بتانا چاہتی تھی مگر منہ پر پڑنے والے پے در پے تھپڑوں نے اسے کچھ کہنے کا موقع ہی نہیں دیا۔ وہ اسی وقت اسے اس کے لمبے بالوں سے کھینچتی چھت سے نیچے لائی تھیں۔ کاشف کے بیان میں کوئی جھول نہیں تھا، علیزہ پر فرد جرم عائد ہو گئی۔

صحن کے ٹھنڈے فرش پر بے حس و حرکت وہ اکیلی بیٹھی سب کے کوسنے بھی سن رہی تھی اور مار بھی کھا

رہی تھی۔ اس کا سر ایک مرتبہ پھر قطعی بے گناہ ہوتے ہوئے، مجرم کی طرح جھکا ہوا تھا جبکہ اس کے اردگرد کھڑے لوگ اس پر لفظوں کی جوتیاں برسا رہے تھے۔

"ایک نمبر کی بے غیرت لڑکی ہے یہ امی! اتنا بھی خیال نہیں کہ کاشف اس کا بہنوئی ہے۔"

سرخ آنکھوں کے ساتھ روتے ہوئے یسری اس پر چلا رہی تھی اور وہ پتھر بنی بیٹھی تھی۔

"میں بھی کہوں میرا بچہ کیوں رخصتی کی ضد کر رہا تھا، اب سمجھ میں آ رہا ہے کہ وہ گھر کی عزت بچانا چاہتا تھا، مگر کامیاب نہیں ہوا اسی لیے چھوڑ کر چلا گیا اسے۔ ہائے حسن، کیے ابا جی نے میرے چاند سے بیٹے کی زندگی برباد کر دی۔ آپ ابھی فون کریں اسے اور کہیں کہ وہ ابھی فون پر طلاق دے اسے۔"

زرینہ بھی پیچھے نہیں رہی تھیں، جبکہ محسن صاحب اور حسن صاحب سر جھکائے کھڑے تھے۔ تیز بخار میں جلتی ثمینہ نے سب کے تبصرے سنے تھے اور پھر خوب رویا تھا۔

اسے لگا وہ اب زندگی میں کبھی سر اٹھا کر نہیں دیکھ سکے گی۔ اس کی گردن ایک انجانے سے بوجھ کے احساس سے جیسے ٹوٹی جا رہی تھی۔

آزر اس کی ماں کی طبیعت کے پیش نظر انہیں کندھوں سے پکڑ کر کمرے میں لے گیا تھا۔ کاشف یسری کو لے کر اپنے گھر چلا گیا۔ محسن صاحب اور حسن صاحب بھی اپنے اپنے کمروں میں چلے گئے تو علیزہ صحن کے بیچ وہ اکیلی بے حس و حرکت بیٹھی رہ گئی تھی۔ تیز بارش نے بھی اسے وہاں سے اٹھنے پر مجبور نہیں کیا تھا۔

اس کے ذہن میں اس وقت جیسے جھکڑ چل رہے تھے۔

"ایک نمبر کی بے غیرت لڑکی ہے یہ امی! اس نے یہ بھی نہیں سوچا کاشف اس کا بہنوئی ہے۔" یسری کی آواز اور لفظوں کے کوڑے تھے جو اس کی روح پر پڑ رہے تھے۔ فوراً ہی ان کوڑوں کا انداز بدلا تھا۔

"میں بتاؤں کہ تم نے کیا کیا ہے، گھر بھر میں ذلیل و رسوا کر کے رکھ دیا ہے تم نے مجھے، کسی کے سامنے سر اٹھانے کے قابل نہیں چھوڑا۔ بیٹی رحمت ہوتی ہے لیکن تم زحمت بن گئی ہو میرے لیے۔"

اس کی مدعا پر یہ کوڑے برسانے والی اس کی اپنی ماں تھی، اس نے اپنا سر گھٹنوں میں چھپا لیا۔

"علیزہ میں جانتا ہوں، تمہیں اب مجھ سے محبت نہیں رہی ہے، وہ بچپن تھا جس میں میرے کسی اور کے ساتھ کھیلنے پر تم بھاگی ہوئی آتی تھیں اور میرا ہاتھ پکڑ کر کہتی تھیں 'مسیلا اے' اب شاید ایسا نہیں ہے۔"

یہ آواز احراز عبدالہادی کی تھی، اس کے احراز کی، جسے اس نے دل کی گہرائیوں سے ٹوٹ کر چاہا تھا، جو اس کے دل کی اولین خواہش اور اس کا پہلا خواب تھا مگر اس کے کردار اور ایمان کی مضبوطی نے اس شخص کو بھی اس سے دور کر دیا تھا اور اب وہ گری تھی تو ایک ایسے شخص کی وجہ سے، جسے وہ اپنی نفرت کے قابل بھی نہیں سمجھتی تھی۔

بارش تھمی تھی جب وہ اٹھ کر منیر صاحب کے کمرے میں آئی تھی، تھر تھر سردی سے کانپتی۔ وہ سو رہے تھے، علیزہ نڈھال سی ان کے بیڈ پر بیٹھ گئی۔

"میں نے کچھ نہیں کیا دادا جی، خدا کی قسم یہ لوگ جھوٹ بول رہے ہیں۔ میں نے کچھ نہیں کیا۔" مگر وہاں اس کی پکار اور اس کا رونا سننے والا کوئی نہیں تھا۔ اس کے پرہیزگار، مشفق، جان لٹانے والے دادا جی، ہارٹ اٹیک کا شکار ہو کر کب کی پلکیں موند چکے تھے، شاید وہ اتنا ہی برداشت کر سکتے تھے۔ علیزہ کا دل بہت زور سے دھڑکا تھا۔

"دادا جی!"

اس نے آواز دی مگر منیر صاحب نے آنکھیں نہیں کھولی تھیں۔ اس کے ہر دکھ پر تڑپ جانے والی وہ ہستی پہلی بار بے سدھ گہری نیند سو رہی تھی۔ تبھی وہ چلا اٹھی۔

"دادا جی، پلیز آنکھیں کھولیں۔"

اور آزر جو ابھی ابھی مسز حسین کے کمرے سے نکلا تھا، لپک کر فوراً وہاں چلا آیا۔

"کیا ہوا؟"

"پتا نہیں، پلیز دادا جی کو دیکھو، یہ آنکھیں نہیں کھول رہے ہیں۔"

"تم ہٹو پیچھے میں دیکھتا ہوں۔"

وہ بھی پریشان ہو گیا تھا۔ اگلے پانچ منٹ میں وہ دونوں انہیں ہسپتال لے آئے تھے۔ پیچھے حسن صاحب اور محسن صاحب بھی آگئے، عجیب قیامت کی رات تھی کہ اس سے رویا بھی نہیں جا رہا تھا۔ بھیگے کپڑوں کے ساتھ، ہسپتال کے ٹھنڈے فرش پر بنا کسی گرم شال کے سوائیوں کی طرح بیٹھی وہ روئے جا رہی تھی، پچھلے چند دنوں میں اس نے اتنا کچھ کھویا تھا کہ اب میں اب مزید کچھ کھونے کی ہمت ہی نہیں رہی تھی۔

صرف ایک رشتہ ہی تو باقی بچا تھا اس کے پاس جینے کے لیے اور اب وہ رشتہ بھی ہاتھ سے چھوٹتا دکھائی دے رہا تھا۔

اگلی صبح اپنے ساتھ نئے طوفان لے کر حاضر ہوئی تھی۔

گزشتہ رات علیزہ حسین کی زندگی کے سب سے پیارے رشتے نے "اسے ہمیشہ تنہا رونے کے لیے اکیلا چھوڑ دیا تھا۔ گھر میں سب لوگ رو رہے تھے۔ منیر صاحب سے اپنی محبت اور تعلق کا اظہار کر رہے تھے مگر وہ خاموش تھی۔ یوں جیسے اس کی خوب صورت آنکھوں کی جھیلیں خشک ہو گئی ہوں۔

تدفین سے قبل احرار حسن بھی پاکستان پہنچ گیا۔ گھر کی خواتین میں ایک طرف سر جھکائے بیٹھی علیزہ حسین کو اس کی آمد کی خبر ہی نہیں ہو سکی تھی، سوئم والے روز جب وہ تیز بخار میں سوگوار سی صوفے پر پاؤں سمیٹے بیٹھی تھی اس نے نرجس چچی کو کہتے ہوئے سنا تھا۔

"اب تو ٹھنڈ پڑ گئی تمہارے سینے میں، لے لی اباجی کی جان۔ اب کرلینا عیاشی جی بھر کر۔"

"ہوش سے کام لیں بھابھی، یہ وقت ایسی باتوں کا نہیں ہے۔" زرینہ جو قریب ہی بیٹھی تھیں۔ فوراً بولی تھیں مگر نرجس نے پروا نہیں کی۔

"کیوں ہوش سے کام لوں، دنیا کو پتا تو چلے اس کے کرتوتوں کا، صرف اسی کی وجہ سے اباجی کی جان گئی ہے۔"

"پھر بھی ہمارے گھر کی عزت کا معاملہ ہے۔"

"آپ رکھیں اسے عزت بنا کر ہم تو اب اس گھر میں ایک پل بھی نہیں رہیں گے، ہونہہ آئی بڑی گھر کی عزت۔"

ان کا غصہ ابھی تک کم نہیں ہوا تھا۔ علیزہ پتھر کے بت کی طرح خاموش بیٹھی رہی۔ وہ جانتی تھی کہ اب اسے اس گھر کی عزت نہیں رہنے دیا جائے گا۔ وہ ایک شخص جو اس کے دل کی اولین خواہش اور اس کا پہلا خواب تھا، اس شخص کو اب اس کے سکھ اور دکھ کا ساتھی بھی نہیں رہنے دیا جائے گا۔

ابھی تک اس نے احرار حسن کا سامنا نہیں کیا تھا مگر پھر بھی وہ جانتی تھی کہ وہ شخص اب اس کے ساتھ نہیں رہے گا۔ اسے اپنی عزت اور اپنے رشتے علیزہ حسین سے زیادہ پیارے تھے اور ایسا ہی ہوا تھا۔ یہ اس سے اگلے روز کی بات تھی جب شام میں سب احرار کو گھیر کر گویا عدالت لگا کر بیٹھے تھے۔ زرینہ اور نرجس چچی نے ایک ایک بات خوب بڑھا چڑھا کر پیش کی تھی جبکہ اس کی اپنی ماں تاحال خاموش کھڑی تھیں شاید انہیں اس گھر میں رہنا تھا، شوہر اور سسر کے بعد بیٹی کی حمایت میں بول کر وہ اس گھر سے ہمیشہ کے لیے دربدر ہونا نہیں چاہتی تھیں تب ہی خاموش تھیں۔ مگر لبری، کمل اور باقی لوگ خاموش نہیں تھے۔ احرار سر جھکائے سب کی باتیں سن رہا تھا جب زرینہ نے اس سے کہا۔

"علیزہ اب ہماری بہو رہنے کے قابل نہیں ہے احرار، بہتر ہے تم اسے ابھی طلاق دے کر فارغ کر دو، میں اب مزید کوئی تماشا دیکھنے کی پوزیشن میں نہیں ہوں۔"

علیزہ کی آنکھوں سے آنسو موتی کی لڑیوں کی طرح ٹوٹ کر گر رہے تھے۔

"علیزہ جیسی لڑکیاں کسی ایک کی ہو کر رہ ہی نہیں سکتیں۔ یہ بھی بھی تمہاری وفادار نہیں ہو سکتی۔" نرجس نے نفرت سے کہا تو وہ بھڑک اٹھا۔

"بس بڑی امی بس۔ بہت کیچڑ اچھال لیا آپ نے اس کی ذات پر اور بہت صبر سے کام لے لیا میں نے۔"

"احرار! تم پاگل ہو گئے ہو بھلا اس لہجے میں بات کرتے ہیں بڑوں سے؟ یہاں کوئی کسی پر کیچڑ نہیں اچھال رہا ہے، ہم سے جو کہا ہے وہ گواہیوں سمجھ لو کہ ایک طرف تمہاری ماں کھڑی ہے اور دوسری طرف یہ لڑکی اب فیصلہ تمہیں کرنا ہے کہ کس کو چنتے ہو کسے چھوڑتے ہو۔" اس کے بھڑک اٹھنے پر زرینہ نے اسے پکارا تھا۔ جب وہ ان کی طرف پلٹ آیا۔

"میں اپنی ماں کو چنوں گا امی، باوجود اس کے کہ میری ماں نے حق اور سچ کا ساتھ نہیں دیا، باوجود اس کے کہ میری ماں نے کسی بے قصور بے گناہ کا دل دکھایا ہے، میں اپنی ماں کو ہی چنوں گا کیونکہ بیٹا جو ہوں آپ کا۔"

"میں نے کسی کا دل نہیں دکھایا، جو حقیقت تھی وہ سب جانتے ہیں۔"

"سب وہ نہیں جانتے جو حقیقت ہے۔"

"کیا مطلب ہے تمہارا، ہم جھوٹ بول رہے ہیں۔"

"میں آپ کو جھوٹا نہیں کہہ رہا مگر سچائی وہ نہیں ہے امی! جو آپ جانتی ہیں۔ سچائی وہ ہے جو میں جانتا ہوں۔ آپ کیا سمجھتی ہیں کسی بھی لڑکی کو پاکدامنی بس یہی ہے کہ کوئی بھی اس پر جھوٹا الزام لگا دے تو وہ گنہگار ثابت ہو جائے گی۔ مجھے دیکھیے، میں کاشف بھائی سے زیادہ خوب صورت اور اسمارٹ ہوں، کس چیز کی کمی ہے مجھ میں، جائز رشتہ بھی ہے میرا اس کے ساتھ اس کے باوجود میں اس کی پارسائی کو چیلنج نہیں کر سکا، کبھی بتایا اس لڑکی نے آپ کو کہ کیوں اسے مجھ سے انکار کر چلا گیا تھا میں؟ نہیں بتایا ہوگا اس نے، بتا دیتا ہوں۔ میں اپنے نفس کے بہکاوے میں آ گیا تھا۔ رخصتی سے قبل ہی اسے اپنی خواہش کے تابع کرنا چاہا تھا۔ مگر اس نے میری خواہش کے سامنے سر نہیں جھکایا، جانتی ہیں کیوں؟ کیونکہ اسے اپنی ماں کا مان عزیز تھا، اپنی حیا اور اپنا کردار عزیز تھا۔ تو پھر میں کیسے مان لوں کہ یہ لڑکی ایسے کمزور کردار کی ہو گی۔"

علیزہ کے آنسوؤں میں مزید شدت آ گئی!

"آپ لوگوں کو شاید پتا ہی نہیں ہے کہ اللہ نے ایک مومن عورت پر بہتان لگانے والوں کی سزا کیا رکھی ہے، یہ چاہتی تو میری خوشی کے لیے میری خواہش پوری کر سکتی تھی، میں اس کا قانونی اور شرعی شوہر تھا مگر اس نے میری خواہش کے سامنے سر نہیں جھکایا۔ اس نے مجھے بتایا کہ اس کا کردار کتنا مضبوط ہے، اسی نے مجھے بتایا عورت کی اصل خوب صورتی کیا ہے، ایک عورت محبت کے بغیر سو سال گزار سکتی ہے مگر عزت کے بغیر ایک لمحہ نہیں۔"

وہ جذباتی ہو اٹھا۔ علیزہ روتی رہی۔

"احرار تم بیوقوف بن رہے ہو، کاشف نے خود اسے۔"

"کیا کاشف نے خود اسے۔؟ کاشف اس گھر کا داماد ہے تو اس کی ہر بات معتبر ہے اور یہ بیٹی ہے تو اس کی کسی بات کی کوئی اہمیت نہیں، آپ کومل سے پوچھیں اس کے ساتھ کیا کیا تھا کاشف بھائی نے۔"

وہ بھڑکا تھا اور وہاں موجود سب لوگوں کو جیسے سانپ سونگھ گیا۔ خود کاشف بھی کب وہاں سے کھسکا، کسی کو پتا نہ چل سکا۔ کمل سے پہلے کومل نے سب کے سامنے کاشف کے کردار کا بھانڈا پھوڑا تھا۔ جب ایک روز اسے کمرے میں تنہا پا کر وہ اس کے ساتھ بدتمیزی پر اتر آیا تھا مگر کومل نے عزت کے ڈر سے اور پھر اپنی بہن کا گھر بچانے کے لیے اس بات کا تذکرہ سوائے احرار کے اور کسی سے نہیں کیا۔

"سارا گھر بھی آج اگر اس کے خلاف ہو جائے، تب بھی میں علیزہ کا ساتھ دوں گا امی کیونکہ یہ میری عزت ہے۔ آج اگر یہ بے عزت ہے تو اس میں میرا قصور ہے، میں اس کی عزت نہیں کروا سکا، حالانکہ میں نے اپنے دادا جی سے اس کا وعدہ کیا تھا کہ اسے عزت

اور تحفظ فراہم کروں گا' مگر اپنی جھوٹی انا کو قائم رکھنے کے لیے میں اپنے فرض سے غافل ہو گیا اور دوسروں کو موقع مل گیا۔" تب کی زبانوں کو تالا لگ گیا تھا۔ علیزہ کے آنسو تھم چکے تھے۔ اس کا صبر رائیگاں نہیں گیا تھا' اس کے ایمان اور کردار کی مضبوطی نے اسے سرخروئی نصیب کر دی تھی۔

پہلی بار اسے جنم دینے والی ماں کا سر سب کے درمیان فخر سے بلند ہوا تھا۔ پیار بھری ایک نظر علیزہ پر ڈالنے کے بعد انہوں نے روتے ہوئے احزار کو گلے لگایا تھا۔

☼ ☼ ☼

رات میں جب وہ اپنے کمرے میں آیا تو علیزہ اسی کے کمرے میں بیڈ کی پٹی سے ٹیک لگائے بیٹھی اسی کا انتظار کر رہی تھی۔ وہ دروازہ لاک کرنے کے بعد اس کے مقابل آ بیٹھا۔

"السلام علیکم!"

"وعلیکم السلام۔!" بخار کی حدت سے دہکتے چہرے کے ساتھ اس نے سر اٹھا کر احزار کو دیکھا تھا۔ وہ اسے ہی دیکھ رہا تھا۔

"میرا خیال تھا تم پر صرف بلیک اور سرخ کلر ہی جچتا ہے' مگر یہ تو آج پتا چلا کہ تم سفید کپڑوں میں سب سے زیادہ پیاری لگتی ہو۔"

اس کا وہی نارمل انداز تھا' علیزہ کے دل میں جانے کیا آئی کہ وہ اس کے گلے لگ کر بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

"اوئے پاگل۔۔ خبردار اب اگر مزید ایک آنسو بھی بہایا تو۔۔ تمہارا بدھو لوٹ کر گھر کو آ گیا ہے نا' پھر اب رونے کی کیا ضرورت ہے؟"

اسے پیار سے خود سے الگ کرنے کے بعد' اپنے ہاتھوں سے اس کے آنسو پونچھتے ہوئے اگلے ہی پل اس نے اپنا بازو اس کے کندھوں کے گرد پھیلا دیا تھا۔

"دیکھو علیزہ! جب انسان پر نفس غالب آتا ہے تو وہ اچھے برے' جائز ناجائز کی تمیز کرنا بھی بھول جاتا ہے' میں غلط نہیں تھا لیکن تم بھی اپنی جگہ صحیح تھیں۔ جس معاشرے میں ہم رہتے ہیں اس کی روایات کا احترام کرنا بھی ضروری ہے۔ میں یہ بھول گیا تھا کہ میری اس لمحاتی لغزش کے ایسے نتائج بھی نکل سکتے تھے جو ہم دونوں کے لیے شرمندگی کا باعث ہوتے۔ مجھے معاف کر دو۔"

علیزہ کے دونوں ہاتھ تھامے وہ اسے اپنے غلط عمل کی وضاحت دے رہا تھا۔ وہ اس کے کندھے سے ٹیک لگائے بیٹھی چپ چاپ سنتی رہی۔

"تم میرا مان ہو علیزہ' میں اپنے اللہ کا جتنا بھی شکر ادا کروں کم ہے کہ اس نے میری تقدیر میں تم جیسی صابر اور باکردار بیوی لکھی۔"

"تم نے مجھے بہت ہرٹ کیا تھا احزار' مگر سب کے درمیان جیسے تم نے مجھے معتبر کیا ہے' اس احسان کے لیے میں نے تمہارے سارے قصور معاف کیے۔"

"اچھا جی ملکہ عالیہ' بہت بہت مہربانی' اب پلیز بڑی امی اور میری مما کو بھی معاف کر دینا' وہ دونوں تم سے بہت شرمندہ ہیں۔"

"نہیں' مجھے تمہاری ماں سے کوئی شکایت نہیں ہے احزار' انہوں نے دوسروں کی آنکھوں اور کانوں سے دیکھا سنا' مگر میری ماں' وہ تو میرا حوالہ تھیں احزار' میں نے ان کی کوکھ سے جنم لیا تھا' وہ تو جانتی تھیں کہ میں ایسی نہیں ہوں' پھر بھی انہوں نے میرا ساتھ نہیں دیا' اس روز جب سب مجھ پر لفظوں کے پتھر برسا رہے تھے' وہ خاموش کھڑی میرا تماشا دیکھتی رہیں' انہوں نے ایک بار بھی یہ نہیں کہا کہ میں ایسی نہیں ہوں وہ تو میری ماں تھیں احزار! ماں سے بڑھ کر اولاد کو کون جان سکتا ہے؟"

"وہ مجبور تھیں علیزہ' پلیز معاف کر دو انہیں پلیز۔"

اب وہ اس کی آنکھوں میں جھانک رہا تھا۔ علیزہ نے آہستہ سے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے پلکیں موند لیں۔ بہت دنوں کی تھکن کے بعد اس رات اسے

سکون نصیب ہوا تھا۔

☼ ☼ ☼

منیر صاحب کے چالیسویں کے بعد احزار اور علیزہ کا ولیمہ منعقد کیا گیا تھا۔

یسریٰ اس تقریب میں شرکت کے لیے نہیں آئی تھی' مگر عمل اور کومل نے علیزہ کو پوری پوری کمپنی دی تھی۔ بلیک ڈنر سوٹ میں احزار بے حد خوب صورت دکھائی دے رہا تھا' جبکہ علیزہ نے بھاری کام والی فراک پہنی تھی۔ احزار بظاہر اسے نہیں دیکھ رہا تھا مگر اس کی ساری توجہ اسی پر تھی۔

رات تقریباً گیارہ بجے وہ دونوں کمرے میں آئے تو علیزہ کا موڈ بے حد آف تھا۔ احزار کی اتنے دن کی بے نیازی نے اسے بہت ہرٹ کیا تھا' کہاں تو ایک دن صبر نہیں ہو رہا تھا اور کہاں اب ساری بے قراری ہی سرد پڑ گئی تھی۔

وہ بیڈ پر آکر بیٹھی تو احزار نے اسے پھر تپا دیا۔

"تم تھک گئی ہو گی علیزہ' یہ بھاری ڈریس اتار کر ریسٹ کر لو۔"

"کیوں میں کھیتی باڑی کر کے آئی ہوں جو تھک گئی ہوں گی۔" اس کے خفا خفا سے لہجے پر چونک کر پلٹتے ہوئے وہ مسکرایا تھا۔

"نہیں یار۔۔ بابا اتنی دیر تک ایک ہی پوزیشن میں سر جھکا کر بیٹھی رہی ہو۔ اسی لیے کہہ رہا تھا۔"

"بہت شکریہ' میرا احساس کرنے کے لیے' تمہیں تھکن محسوس ہو رہی ہے تو سو جاؤ' مجھے جب محسوس ہو گی میں سو جاؤں گی۔"

وہ خفا بھی تھی اور اس کی آنکھوں میں آنسو بھی تھے۔ احزار کا دل مچل اٹھا تھا۔

"ٹھیک ہے' مگر رو کیوں رہی ہو؟" اس کے مقابل بیٹھتے ہوئے وہ اسے تنگ کرنے سے باز نہیں آیا تھا۔

علیزہ نے آنکھیں صاف کر لیں۔

"میری مرضی میں روؤں یا ہنسوں' تمہیں کیا فرق پڑتا ہے۔"

"فرق تو پڑتا ہے یار۔!" مسکرا کر کہتے ہوئے اس نے اپنے بازو علیزہ کے گلے میں ڈال لیے تھے۔

"صاف صاف کیوں نہیں کہتیں کہ۔۔" نچلا لب دبا کر مسکراتے ہوئے اس نے شرارت سے اسے دیکھا تھا۔ جواب میں علیزہ نے ایک نظر اسے دیکھتے ہوئے سر جھکا لیا۔

"اگر تم اسی میں خوش ہو تو مجھے تم سے کوئی گلہ نہیں ہے احزار' شاید میں اس قابل بھی نہیں ہوں کہ۔۔"

"اوئے۔۔ جان لے لوں گا تمہاری اگر کوئی غلط بات زبان سے نکالی تو' پاگل لڑکی' سچ میں پگلی لڑکی ہو تم' قسم سے' ایویں تنگ کر رہا تھا تمہیں اتنے دنوں سے تم بھی نا۔" وہ نادم بھی تھا اور مسکرا بھی رہا تھا۔ علیزہ کی پلکوں سے آنسو ٹوٹ کر گریبان میں جذب ہو گیا۔

"اور وہ جو رخصتی والے دن کہا تھا کہ تمہاری خواہش مر گئی ہے وہ۔؟"

"ہاہاہا۔۔ وہ بھی تنگ ہی کر رہا تھا تمہیں' مگر تم ہو میری ہی نہیں تنگ' خیر اب کیا ارادہ ہے؟"

شرارتی لہجے والے اس شخص کی روشن نگاہوں میں خوشی اور مسرت کے ہزاروں جگنو دمک رہے تھے۔ علیزہ آنسو پونچھتے ہوئے مسکرا دی۔

"نہیں۔"

"کیا نہیں' بہت پتھر رکھ لیے دل پر' اب ایک لمحے کی رعایت بھی نہیں دوں گا تمہیں' ایسی کی تیسی تمہاری نہیں کی۔"

اس بار مسکرا کر کہتے ہوئے احزار نے اسے اپنی گرفت میں لے لیا۔ علیزہ کی روح سرشار ہو گئی۔ اپنے اپنے جذبوں میں ثابت قدم ان دونوں محبت کرنے والوں کے لیے' خوشبو لٹاتی اس رات کا ایک ایک پل مہک رہا تھا۔

READING CORNER
http://readingcornermk.blogspot.com